تین درویش، ایک شہزادی

محمد اکرم سعید

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 2 (1,1)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

Book Name: Teen Darwesh, Aik Shehzadi
Written by: Muhammad Akram Saeed
Phone # 0335-4921473
Co-ordination : Rifat Saeed, Sadia Zafar
Composed by: Ashraf Naqvi, Phone # 0345-6352439
Publishing year: 2025
Price: Rs. 1500/-

نام کتاب: تین درویش، ایک شہزادی
مصنّف: محمد اکرم سعید
فون نمبر: 0335-4921473
معاونت: رفعت سعید، سعدیہ ظفر
اشاعتِ اوّل: 2025ء
کمپوزنگ وسرورق: اشرف نقوی، فون نمبر: 0345-6352439
تعداد: 500
قیمت: -/1500 روپے

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 3 (1,1)

اپنی شریکِ حیات

رفعت سعید

کے نام

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 4 (1,1)

حُسنِ ترتیب

نمبرشمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	کانٹے اور پھول از پروفیسر ڈاکٹر خرم عباس ورک	5
2	اختر شیرانی، خاکوں کے پس منظر میں شخصی تجزیاتی مطالعہ	8
3	میرا جی۔ غلیظ پیکر، لطیف روح	78
4	معصوم بادہ نوش	112
5	ایک تھی پارو	136
6	کتابیات	189

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 5 (1,1)

کانٹے اور پھول

فن صرف طرزِ اظہار ہی نہیں، طرز احساس بھی ہوتا ہے اور یہی طرزِ احساس طرزِ حیات ہوتا ہے جو آپ کے طرزِ بیان میں متشکل ہوتا ہے ۔ اِس تناظر میں پروفیسر محمد اکرم سعید کے نظریۂ حیات اور طرزِ فکر کو پرکھا جائے تو باور ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے، چکھنے، محسوس کرنے اور بیان کرنے کے رسیا ہیں ۔ زندگی کی بہت سی کڑواہٹیں اُن کی زبان کی شیرینی کے مقابل بے بس دکھائی دیتی ہیں ۔ موسمِ بہار کی معطر رنگینیوں کے قصائد تو ہر کوئی پڑھتا ہے ۔ پروفیسر محمد اکرم سعید سخت سردی اور ناقابل برداشت گرمی، یہاں تک کہ اگست جیسے حبس زدہ موسم میں موجود قدرت کی مصلحتوں کا مقدمہ بھی اِس انداز سے لڑتے ہیں کہ سُننے والا ان موسموں سے جڑے ذائقوں اور فوائد کا تصور کر کے اُن کے جلد آنے کا منتظر ہوتا ہے ۔ غرض اِن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو قعرِ دریا میں سورج کی کرن کے منتظر رہتے ہیں، جنھیں آدھا گلاس بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے، جو گلاب کو کانٹوں سمیت قبول کرتے ہیں، جو ہیروں کی خوب صورتی سے ذرّوں کے حُسن کو سوا اہمیت دیتے ہیں جن کی نگاہ جوہڑ کے گدلے پانی پر نہیں بل کہ اُس میں کِھلے کنول پر ٹھہرتی ہے ۔ وہ ہمیشہ مقتدرہ کے مقابل ناتواں کے حق میں آواز اُٹھاتے ہیں ۔

اُن کے اِس طرزِ فکر کی پرچھائیاں اُسلوبِ حیات کے ساتھ ساتھ اُسلوبِ تحریر میں بھی جلوہ نما ہوتی ہیں ۔ شعر و اَدب سے وابستہ نمایاں شخصیات پر کام کرتے ہوئے اُن کی نظرِ انتخاب اُن شعراء پر پڑتی ہے جو بعض بشری، نفسی یا خصلتی کجیوں کے سبب معتوب ٹھہرے، جنھیں یا تو نظر انداز کیا گیا یا پھر یار لوگوں نے اُن کی زندگیوں کے تاریک گوشوں کو مزید تاریک کر کے یوں پیش کیا کہ اُن کے اندر موجود روشنی اور اُن کی اصل شخصیت پردۂ اخفاء میں دب گئی ۔

محمد اکرم سعید نے دل چسپ اور دل کش عنوان کی حامل اپنی تصنیف ”تین درویش

ایک شہزادی‘‘ میں معروف شعراء اختر شیرانی، عبدالحمید عدم، میرا جی اور پروین شاکر کی شاعری کے حوالے سے انتقادی آراء کا اِظہار نہیں کیا بل کہ اُن کی شخصیات سے جُڑے منفی تاثرات کو مثبت کرنے کی کوشش کی ہے اور بہ طور انسان اُن کے مقام و مراتب اور عظمت کو دریافت کیا ہے۔ اس کے لیے مصنّف نے ان شعراء پر لکھی گئی کتب، خاکوں اور مضامین کے مندرجات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ان مذکورہ شعراء کی شخصیات پر بحث کی ہے اور یوں اُردو شاعری کے محبوب کو وجود بخشنے والے رومانوی شاعر اختر شیرانی کے تذکرے کو شراب و شباب اور باپ بیٹے کے اختلافات کی زد سے نکال کر ایک نرم دل، مہذّب، احترامِ خواتین سے آشنا انسان کی صورت قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہی نہیں بل کہ ایک سچے عاشقِ رسول کو بھی دریافت کیا ہے۔

عبدالحمید عدم کو بھی محمد اکرم سعید، شاعری اور شراب سے الگ کر کے اُن کی نجی اور مجلسی زندگی کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور پھر بڑے مدلّل انداز میں چنیدہ اقتباسات کی شمولیت سے قاری کی ملاقات ایک اور عدمؔ سے کرواتے ہیں۔ ایک ایسے معصوم اور سادہ انسان سے جو ناشرین سے لُٹنے اور احباب سے دھوکہ کھانے کے بعد بھی انسان کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتا رہا۔ ایسے خواب جو اُس کی شاعری کی طرح شبنم سے بھی زیادہ دلکش ہیں۔

اِسی طرح ثناء اللہ ڈار معروف بہ میرا جی کا نام سُنتے اور پڑھتے ہی جو اِبتدائی تصوّر اُبھرتا ہے وہ ایک ایسے مسافر کا ہے جو گلے میں مالا ڈالے، ہاتھ میں گولے پکڑے گھر کا رستہ بھول کے نگری نگری پھر رہا ہے، جس کا جسم کثیف اور لباس غلیظ رہتا ہے۔ مصنّف کمال مہارت سے اِسی کثافت اور غلاظت میں سے ایک لطیف اور پاکیزہ روح برآمد کرتا ہے اور قاری سے اُس کا تعارف اِس طرح سے کرواتا ہے کہ وہ باہم دوست بن جاتے ہیں۔

پروین شاکر اُن شاعرات میں شمار ہوتی ہیں جن کی شاعری اور شخصیت دونوں مسلسل زیرِ بحث رہی ہیں۔ اُن کی شاعری اپنی شُستگی، عمدگی اور تانیثت کے سبب پڑھنے والوں کی مشترکہ پسند رہی ہے اور شخصیت ہمیشہ اسکینڈلز کی زد میں۔ کچھ تو اُن کی زندگی میں پیش آمدہ

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 7 (1,1)

واقعات نے لوگوں کو مواقع میسّر کیے اور کچھ لکھنے والوں کی نوکِ قلم میں موجود مصالحہ جات نے اُن کی زندگی کو بارہ مصالحوں والی چاٹ بنا کے رکھ دیا۔اُن کی زندگی کے راستے تو مشکل تھے ہی، شہر کے لوگ بھی بہت ظالم نکلے۔ بسا اوقات تو یوں لگتا کہ ''رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی ہے۔''

محمد اکرم سعید نے اپنے اِس مطالعے میں غنڈوں میں پھنسی اسی رضیہ کو رہائی دلانے کی کوشش کی ہے۔ پروین شاکر کی اصل شخصیت ، اُن کی فکر، فطرت، طرزِ زیست ، تہذیب اور پچھتاوے کو(جو لکھنے والوں کی افسانہ طرازیوں کی دبیز تہہ میں چُھپ چُکے تھے) آشکار کیا ہے۔ بھیڑیا نما مردوں کے معاشرے میں حُسن، فن اور نزاکت کی یک جائی کتنا بڑا جرم بن جاتا ہے، محمد اکرم سعید نے اپنے اِس مضمون میں یہی کچھ بیان کیا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی سادہ و دل کش اُسلوب میں لکھے گئے یہ مضامین اُردو شاعری میں معتبر اور بنیادی حوالے کی حیثیت کے حامل ان شعراء کی شخصیات کے بارے میں قائم تاثر کو یکسر نہیں تو بہت حد تک ضرور تبدیل کر دیتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر خرم عباس وِرک

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 8 (1,1)

اختر شیرانی

خاکوں کے پس منظر میں شخصی تجزیاتی مطالعہ

اختر شیرانی نے اپنے خودنوشت ''خاکے''(1) (جسے صحیح معنوں میں خاکہ تو نہیں مختصر تعارف کہنا چاہیے) میں اپنی نجی زندگی کے کچھ واقعات تحریر کیے ہیں ۔اپنے تعارف میں لکھتے ہیں کہ:

''1905ء (2)کے اواخر میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوا۔ جہاں غالباً میرے دادا مولوی محمد اسمٰعیل خاں(3)تشریف لائے اور مختلف مناصب پر ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔' (4) میرے والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔اُن کے نام سے علمی دُنیا اچھی طرح واقف ہے۔''(5)

اختر شیرانی مزید لکھتے ہیں:

''1919ء(6)میں والیٔ ریاست کی نگاہِ عتاب نے یہ احسان فرمایا کہ ٹونک کی مختصر مگر جذباتی دنیا کو چھوڑ کر مجھے والد کی معیت میں لاہور جیسی متمدّن، مہذّب اور شاندار دُنیا میں آنا پڑا۔''(7)

لاہور میں اپنی آمد اور تعلیم کے بارے میں اختر شیرانی لکھتے ہیں:

''1921ءمیں اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔دو چار مہینے مُنشی فاضل کی کلاسوں میں پڑھا اور امتحان میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان دیا اور اس میں بھی ممتحنوں کی غلط بخشی یا غلط فہمی کی وجہ سے پاس ہوگیا۔۔۔۔۔ پھر جنونِ عشق و شباب کے سبب تعلیم چھوٹ گئی۔۔۔چند سال گزرنے کے بعد ازسرِنو تعلیم کی دھن سوار ہوئی ۔اپنے پرانے کالج (اورینٹل کالج) میں میٹرک کلاس میں داخل ہوا۔اس کے بعد صحافت کی وحشت ہیولا بن کر کرم فرما ہوئی۔'' (8)

''حافظ صاحب مارچ 1913ءمیں لندن سے ٹونک واپس آئے ۔اُس وقت اختر

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 9 (1,1)

تقریباً نو برس کے ہو چکے تھے۔اب حافظ صاحب نے اختر کی تعلیم کی جانب توجہ فرمائی۔“

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

”حافظ صاحب بیٹے کو بحر العلوم بنانا چاہتے تھے چنانچہ متعدد اساتذہ اختر کی تدریس اور تربیت کے لیے مقرر کیے گئے۔ایک وقت تو اُن کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی۔اُردو، فارسی، دینیات، ریاضی کے علاوہ خوش خطی، ورزش اور پیراکی کے الگ الگ اُستاد تھے۔اُن کی مساعی کے نتیجے میں اختر کی علمی استعداد بہت اچھی، خط بڑا پاکیزہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔اسی دَور میں اختر اپنے ایک اُستاد مولوی محمد صابر شاکر کی تشویق سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے ۔۔۔۔۔۔اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے بعد رسمی تعلیم چھوڑ کر شعر و ادب اور صحافت کو پیشہ بنا لیا۔ حافظ صاحب کو بیٹے کی تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔“ (9)

اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں اختر صاحب نے لکھا ہے:

”ہمایوں“ کی چند روزہ ادارت کے بعد ایک دوست کے نئے رسالے ”بہارستان“ کی ادارت کا بار اُٹھانا پڑا۔میں نے ”خیالستان“ کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ نکالا۔”بہارستان“ کی زندگی میں جب کہ مرحوم مولانا محمد علی (جوہر) نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف قلمی جنگ کا آغاز کر رکھا تھا، میرے ایک مضمون نے جو مولانا مرحوم کی تائید اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھا گیا تھا، مولانا محمد علی کو اِتنا متأثر کیا کہ اُنھوں نے اپنے اِدارہ کے توسط سے مجھے مجبور کیا میں ”ہمدرد“ کے لیے فکاہی کالم کے لیے کم از کم ہفتے میں ایک بار کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیا کروں۔چنانچہ اِس پر کافی عرصے تک عمل ہوتا رہا۔“ (10)

اُن کی ادبی صحافت کے بارے جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

1۔ ”ہمایوں“ (لاہور) شریک مدیر اختر شیرانی (1922ء)

2۔ ”انتخاب“ (لاہور) شریک مدیر اختر شیرانی (1926ء)

3۔ ”بہارستان (لاہور) مدیر اختر شیرانی (مئی 1926ء)

4۔ ”خیالستان“ (لاہور) مدیر اختر شیرانی (1930ء)

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 10 (1,1)

5۔ ’’رومان (لاہور) مدیر اختر شیرانی (1935ء)

اختر شیرانی ان کے علاوہ ’’نوبہار‘‘ (لاہور)، ’’مخزن‘‘ (لاہور) او ’شاہکار‘‘ (لاہور) کے ادارتی عملے سے بھی متعلق رہے۔‘‘ (11)

اختر شیرانی لکھتے ہیں:

’’1935ء میں ’’رومان‘‘ کے نام سے ایک اور پرچہ نکالا جو بوجوہ بند ہوگیا۔‘‘

اختر شیرانی نے تو:

’’رومان‘‘ کے بارے صرف یہی لکھا ہے کہ بوجوہ بند ہو گیا‘‘ مگر ’’رومان‘‘ کے اجراء اور بندش کی کہانی عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور حکیم نیّر واسطی نے تفصیل سے بیان کی ہے۔((12)

رومان کا اجراء اور بندش: عاشق حسین بٹالوی صاحب کا بیان ہے کہ:

’1935ء کے اوائل میں ایک روز میں نے اور اختر نے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی تجویز سوچی۔ اختر گزشتہ آٹھ سال میں یکے بعد دیگرے تین رسالے ’’انتخاب‘‘، ’’بہارستان‘‘، ’’خیالستان‘‘ نکال کر بند کر چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ اُن سے بدظن ہو چکے ہیں اِس لیے اُن کی خواہش تھی کہ اگر ہم نے نیا رسالہ جاری کیا تو سرورق پر صرف میرا یعنی راقم التحریر کا نام بطور ایڈیٹر درج ہونا چاہیے۔ مجھے اُن کی اِس رائے سے اختلاف تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سرورق پر ہم دونوں کے نام درج ہوں گے۔ مارچ 1935ء میں ’’رومان‘‘ کا پہلا پرچہ نکلا۔‘‘ (13)

عاشق حسین بٹالوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

’’میر نور بخش مائر جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے، خوش حال آدمی تھے۔ شعر بھی اچھے خاصے کہتے تھے۔ اُنھوں نے ’’رومان‘‘ کے لیے کلکتہ سے ایک نظم بھیجی جس میں علامہ اقبال کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ بٹالوی صاحب نے تو بغیر دیکھے ہی کہہ دیا کہ اِس قسم کی چیزیں ’’رومان‘‘ میں ہر گز شائع نہیں ہوں گی، مگر اختر نے جولائی کے پرچہ میں اسے شائع کر دیا۔ اور بقول

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 11 (1,1)

بٹالوی صاحب: ’’جب میں نے پوری نظم پڑھی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اب میری اور اختر کی خیر نہیں۔ ہم دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جائے گا۔‘‘(14)

اِس نظم کی اشاعت پر دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ بٹالوی صاحب نے علاّمہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بے گناہی ثابت کر دی۔ دوسرے لفظوں میں سارا الزام اختر کے سر لگا دیا۔

’’رومان تقریباً تین سال جاری رہا۔ اس کی بندش کے حوالے سے بٹالوی صاحب نے لکھا ہے کہ ’’مجھے آہستہ آہستہ سیاسی مصروفیتوں نے اپنی طرف کھینچ لینا شروع کر دیا اور اختر کی شراب نوشی میں اضافہ ہونا شروع ہوا، چنانچہ سارا نظام بگڑ کے رہ گیا۔۔۔۔۔ چنانچہ تین سال کی مختصر سی زندگی کے بعد ’’رومان‘‘ نے بھی عدم کی راہ لی۔‘‘(15)

’’رومان کی کہانی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی یوں بیان کرتے ہیں:

’’اختر شیرانی نے اپنا ذاتی رسالہ ’’رومان‘‘ لاہور سے جاری کیا تھا جو ۱۸ فلیمنگ روڈ سے شائع ہوتا تھا۔ عاشق حسین بٹالوی کو اُنھوں نے اپنا معاون مدیر بنایا۔ رسالے کا ڈیکلریشن ایک دوست کے نام سے لیا تھا۔ جب رسالہ چل نکلا تو اُس ناشر دوست کی نیّت میں فتور آ گیا۔ اُس نے رسالے پر قبضہ جمانا چاہا۔ اِس معاملے میں عاشق بٹالوی صاحب کی ہمدردی اور غالباً مشورہ بھی اُن کو حاصل ہوا۔ اختر کو عاشق صاحب کے اِس رویّے سے صدمہ ہوا۔ اور اِس کا ذکر اُنھوں نے بعض دوستوں سے کیا۔ بالآخر اُن کی جگہ خلیل احمد صاحب کو نائب مدیر مقرر کرنا پڑا۔ عاشق بٹالوی صاحب نے اِس مخاصمت کا بالواسطہ اظہار اختر پر اپنے مضمون میں کیا۔ عاشق بٹالوی صاحب نے اختر سے اپنے اختلاف کی توجیہہ ایک نظم کی اشاعت سے کی ہے اور اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے تحریکِ پاکستان کا سہارا لیا ہے۔‘‘(16)

اِس حوالے سے تابش صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

’’جب اُنھوں نے ’’رومان‘‘ نکالا تو اُس کا ڈیکلریشن ایک دوست کے نام سے لیا۔ جب رسالہ خوب چل نکلا تو دوست اس پر قبضہ کرنے بیٹھ گئے۔ دوستوں نے

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 12 (1,1)

اُس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض احباب نے مقدمہ کی پیروی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں لیکن اختر مرحوم اپنے ایک پرانے دوست کو عدالت میں ذلیل کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور آمدنی کے ایک معقول ذریعے سے محروم ہو کر زندگی کے دن تنگی و تُرشی میں گزار دیے۔"(16_A)

اِس واقعہ کو حکیم نیّر واسطی یوں بیان کرتے ہیں:

'ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلہ میں اُنھیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اُس سے کبھی نہیں ملیں گے لیکن ایک دن جب وہ اُن کے سامنے سے گزرا تو اُس سے لپٹ گئے اور اُلٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔"(17)

حکیم نیّر واسطی کا کہنا ہے کہ:

"اختر نے اپنے مخالف معاصرین سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا، اُسے صبر سے سہہ لیا۔ میں نے اُنھیں دُنیاوی امور میں کبھی کسی سے اُلجھتے نہیں دیکھا۔ یہی اُن کی عالی ظرفی تھی جس کا اعتراف سب دوستوں نے کیا ہے۔(18)

ا اختر شیرانی صاحب نے اپنے ایک مکتوب بنام اعجاز سکندر نازش، "رومان" کے بارے یہ لکھا ہے:

"رومان" کے سلسلہ میں غداری کرنے والے، امیرا مینجر شیخ محمد نواب مالک "زیب النّساء، ۲ خلیل احمد رومان بی۔ اے میرا جائنٹ ایڈیٹر تھے، جو اَب "احسان" میں ملازم اور رسالہ "داستان" کا ایڈیٹر ہے۔"(19)

"رومان" کے اجراء اور بندش کے تذکرے کے بعد دوبارہ اختر شیرانی کے خودنوشت خاکے کی طرف آتے ہیں۔ اختر شیرانی نے اپنی حیاتِ معاشقہ کا ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے اور صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے:

"رہا میری حیاتِ معاشقہ کا تذکرہ، جس سے اکثر عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپیاں وابستہ ہیں، اس کے متعلق لکھنے سے احتراز کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے علم کے بعد نہ کسی عزیز کو میری زندگی سے دل چسپی رہے گی اور نہ کسی دوست کو۔"(20)

اِس جملے سے اختر صاحب کی نہ جانے کیا مراد ہے؟ عزیزوں یا دوستوں کو اُن کی زندگی

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 13 (1,1)

سے کیوں دلچسپی نہیں رہے گی؟ دوست تو اُن کی حیاتِ معاشقہ کے لمحے لمحے سے واقف ہیں اور انھوں نے چسکے لے کر آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

اُن کی ’’حیاتِ معاشقہ‘‘ کا آغاز ٹونک سے ہوتا ہے۔جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

’’اختر کو ایک عشق پرست دل ملا تھا۔لڑکپن سے اُن کا مزاج عاشقانہ تھا۔1919ء تک (جب اختر کی عمر ابھی 14 برس تھی)، اختر دو عشق کر چکے تھے۔ پہلا ٹونک کے حکمران خاندان کی ایک خاتون سے اور دوسرا عشق طبقۂ امراء کی ایک خاتون سے کیا تھا اور ’’دیس سے آنے والے بتا‘‘ میں جس ’’جانِ وطن‘‘ کی خیریت دریافت کی گئی ہے وہ یہی دوسری خاتون ہیں۔‘‘(21)

مگر یہ دونوں عشق اختر کی آئندہ زندگی پر گہرے اثرات مرتّب نہیں کر سکے۔اختر کی اصل ’’حیاتِ معاشقہ‘‘ تولاہور آ کر شروع ہوتی ہے اور سلمیٰ سے لے کر عذرا اور ریحانہ، زہرہ، پروین، ثریا، نسرین، ناہید، لالہ رُخ، شمسہ، لیلیٰ، زلیخا، نو بہار ناز، ماہ لقا وغیرہ تک پھیلی ہوئی ہے۔مگر اس داستان کو زیادہ تر سلمیٰ ہی سے منسوب کیا جاتا ہے اور تقریباً تمام خاکہ نگاروں نے کسی نہ کسی انداز سے اِس کا ذکر کیا ہے۔کسی نے اِس کردار کو فرضی اور اختر کے تخیّل کی اختراع قرار دیا ہے اور کسی نے نام فرضی مگر کردار کو حقیقی قرار دے کر اپنی چشم دید گواہی دی ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے سوال اُٹھایا ہے کہ:

’’اختر نے کسی ایک کا نام تو نہیں لیا، عذرا، ریحانہ کے علاوہ نسرین، پروین، شمسہ، ثریا، ناہید وغیرہ کے بھی نام لیے ہیں۔پھر سلمیٰ ہی کو اختر سے نتھی کیوں کیا جاتا ہے؟ باقی خواتین کو نظر انداز کرنے کا سبب کیا ہے؟‘‘(22)

حکیم نیّر واسطی کا خیال ہے کہ:

’’عذرا ہو، زلیخا ہو یا دیگر۔۔۔۔ان سب میں سلمیٰ ہی کے حُسن و جمال کی بہاریں ڈھونڈتے اور ان پر نثار ہوتے تھے۔وہ سلمیٰ کے سچے عاشق تھے اور وہ چاہتے تھے کہ کہیں وہی جلوہ اُنھیں ایک بار پھر نظر آجائے۔‘‘(23)

یعنی وہ سلمیٰ کے حسن و جمال ہی کو ان حسیناؤں میں ڈھونڈ رہے تھے۔کیا ایسا ممکن

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 14 (1,1)

ہے؟

شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

''اُنھوں نے جوانی میں بیسیوں آنچلوں سے راز و نیاز بڑھائے اور کئی دروازوں پر دستک دے کر لوٹ آئے لیکن سلمیٰ سے اُن کا لگاؤ کبھی ختم نہیں ہوا۔ وہ سلمیٰ کے لیے جیتے تھے اور سلمیٰ کے لیے ہی اجل کو لبّیک کہہ گئے۔''(24)

ایک عاشق صادق کا یہ رویّہ کہاں تک درست ہے کہ وہ بیسیوں آنچلوں سے راز و نیاز بڑھاتے اور جگہ جگہ دروازوں پر دستک دیتے پھریں؟ اور دعویٰ پھر یہی ہو کہ وہ سلمیٰ کے لیے جیئے اور اُسی کے لیے داعیٔ اجل کو لبّیک کہا۔ اِس دعوے کی بجائے شورش کاشمیری صاحب کی یہ بات قابلِ غور ہے کہ:

''اختر کو موت نے نہیں مارا بلکہ وہ خود مرے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں زندگی کے بخیئے اُدھیڑ ڈالے۔''(25)

یعنی اختر کو اُس کی مے نوشی نے مار ڈالا (اور مے نوشی کا آغاز سلمیٰ سے عشق سے پہلے ہو چکا تھا)۔ اس کے بعد یہ مفروضہ کہاں تک درست ہے کہ وہ سلمیٰ کے لیے داعیٔ اجل کو لبّیک کہہ گئے۔ سلمیٰ کے بعد اور بہت سی خواتین سے اختر کی مراسلت رہی۔ حکیم نیّر واسطی کے بقول:

''بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خطوط لکھتی تھیں، بعض اپنے کلام میں اصلاح کے لیے خطوط لکھتی تھیں اور ممکن ہے ان میں سے بعض کو اختر سے کچھ ''دِلی لگاؤ'' بھی رہا ہو، لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حُسن اور نسائیت کے لیے اُس کے احساسات اور بے پناہ طوفانِ جذبات کو دیکھ کر اُس کی قدر دان اور اُس کے ہُنر کی دلدادہ تھیں اور بعض کا معمول یہ تھا کہ اُس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اُس کو اُس کو خطوط لکھتیں اور تفریحاً چھیڑتی تھیں، اور اختر کی ''سادگیٔ تمنّا'' تھی وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبّت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔''(26)

محمد طفیل صاحب نے بھی اختر کی اِس سادگی اور بھولپن کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں اِسے اختر صاحب کی سادگی اور بھولپن ہی کہوں گا کہ اُنھیں اگر

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 15 (1,1)

کوئی لڑکی خط لکھ دیتی تھی کہ ......مجھے آپ کی فلاں نظم پسند آئی ہے یا مجھے آپ کی شاعری بڑی عزیز ہے، تو یہ فوراً اُس لڑکی کا نام محبوباؤں والے رجسٹر پر چڑھا دیتے تھے پھر دوستوں میں تذکرے ہوتے تھے....خط وکتابت ہوتی تھی۔‘‘(27)

کیا ایسی لڑکیاں واقعی معشوقائیں ہوتی ہیں؟ محبوباؤں والے رجسٹر میں نام چڑھا لینے سے وہ محبوبائیں بن جاتی ہیں؟ یہ اختر کی ’’سادگیٔ تمنا‘‘ یا بھولپن ہے، جس سے یارلوگوں نے کیا کیا افسانے تراش لیے اور یہ کہہ کر سارا الزام اختر پر ٹھونک دیا کہ اختر نے ہر مہکتے دروازے پر دستک دی اور ہر مہکتے آنچل کو چھیڑا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ:

’’اختر عورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ جب کوئی حسین عورت دیکھتے، خود سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین عورت کا سامنا ہو جانا اُن کے لیے مصیبت تھا جس کا اظہار اُن کے چہرے سے ہونے لگتا۔‘‘(28)

یہ اُس عشق پرست آدمی کا حال ہے جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ لڑکپن ہی سے مزاج عاشقانہ تھا، مگر حسین عورت کا سامنا اُس کے لیے ایک مصیبت تھا۔

نصر اللہ خاں، اختر کے عشق، سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ وغیرہ کی حقیقت کے بارے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اختر عشق کرنے کی آرزو میں مرتے رہے، لیکن اُن میں روایتی عشق کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یہ فُل ٹائم جاب ہے اور اختر کا مزاج سیمابی تھا۔ وہ بلا کے شرمیلے تھے.....ہاں اگر دُور سے کسی لڑکی کو دیکھ لیتے تو تڑپ اُٹھتے۔ اگر کسی مکان کی کھڑکی میں سے کسی کی جھلک دیکھ لیتے تو دل پکڑ کر بیٹھ جاتے اور پھر اُن کے عشق کا فسانہ شروع ہو جاتا۔ یہ جو اختر کی شاعری میں سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ وغیرہ ہیں، وہ حقیقی شخصیتیں نہیں ہیں۔ جس نے ایک جھلک دِکھا کر دل موہ لیا بس اُسی کا اچھا سا نام رکھ دیا اور اُس پر نظم ہوگئی۔ البتہ لڑکی کی نشان دہی اُس کی رُسوائی کی وجہ سے نہ کرتے۔ رومانی شاعری کی وجہ سے ’’بہت سی لڑکیاں‘‘ اُن پر مرنے لگی تھیں۔ اُن کو محبت بھرے خطوط بھی موصول ہوتے لیکن اختر کا جواب بڑا عصمت مآب ہوتا۔ اُن کا حال یہ

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 16 (1,1)

تھا کہ اگر لڑکی اُن کے قریب آ کر بیٹھ جاتی تو اُن کی نظریں زمین سے نہ اُٹھتیں اور سوچتے کہ کسی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائیں۔‘‘(29)

دُور دُور سے دیکھ کر تڑپنے، عشق کرنے اور دل پکڑ کر بیٹھ جانے والے شخص کا حال یہ ہے کہ لڑکی کے قرب سے گھبراتے اور کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگنے کا سوچتے ہیں اور نظریں زمین سے نہیں اُٹھاتے۔ عورت کا احترام اور ملنے سے جھجک اور گریز کے حوالے سے محمد طفیل لکھتے ہیں:

’’دِلّی میں ’ہز ماسٹرز وائس‘ کے دفتر میں کسی نے مشہور مغنّیہ مُنّی بائی سے اُن کا تعارف کرایا۔ اختر صاحب مارے شرم اور جھجک کے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ مُنّی بائی نے شرارتاً کہا ’’شاعرِ شباب تو کانپ رہا ہے۔‘‘(30)

کانپنے کا سبب کوئی خوف نہیں بلکہ عورت سے حجاب، شرم اور جھجک ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی لکھتے ہیں:

’’اختر میں حیا اور معصومیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اِس کا اندازہ اِس طرح لگائیے کہ سلمیٰ اور اُس کے بعد تقریباً ایک درجن لڑکیوں کے نام اُن کی محبوباؤں کی فہرست میں شامل ہیں لیکن اُن کی زندگی یا جوانی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب اُنھوں نے ہوا و ہوس سے اپنے عشق کو مکدّر کیا ہو۔ محبّت کے معاملے میں وہ پاکیزگی اور معصومیت کے قائل تھے۔ شباب اُن کے ہاں گناہ کی آلودگی سے بچے رہنے کا نام تھا۔ جسمانی قربت کو محبّت اور شباب کے لیے موت خیال کرتے تھے۔‘‘(31)

اختر کی زندگی اور شاعری کا محور عورت تھی لیکن اختر نے عورت کو محض ایک محبوبہ ہی نہیں سمجھا، اُن کے ہاں وہ بیوی، بیٹی اور بہن کے روپ میں بھی جلوہ گر ہے۔ اُنھوں نے اس کی مامتا کو بھی دیکھا ہے۔ اس کا ہر روپ ہی سُندر اور خوب صورت ہے۔ اختر نے عورت کی مجبوری اور لاچاری پر بھی آنسو بہائے ہیں اور اس کی عظمتوں کی بھی تعریف کی ہے۔ ’’نغمۂ حرم‘‘ صرف اُن نظموں پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے عورتوں کے لیے لکھی ہیں۔ اِن نظموں میں وہ ایک دردمند شاعر اور

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 17 (1,1)

انسان کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں۔

حکیم نیّر واسطی کا کہنا ہے کہ:

''اختر بے حد ہمدردِ بنی نوعِ انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا تِلمِلا اُٹھتے اور اکثر رو پڑتے اور عورت ذات کو تو مصیبت میں کبھی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ایک مرتبہ وہ انارکلی میں تانگے پر سوار تھے کہ ایک عورت بھیک مانگنے آ کھڑی ہوئی۔مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہے اسے فوراً دے دو۔میں عورت کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔''(32)

عورت اور عورت کے احترام اور اختر شیرانی کے شرم وحیا اور معصومیت کی باتیں تو ضمناً آ گئی ہیں، اصل موضوع سلمیٰ ہے۔اُس کی جانب دوبارہ پلٹتے اور خاکہ نگاروں کی رائے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کا خیال ہے کہ سلمیٰ، اختر کے ذہن کی اختراع ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''سلمیٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہوئیں۔بعض کہتے ہیں کہ سلمیٰ حقیقتاً کوئی سلمیٰ تھی۔ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو،مگر جو سلمیٰ ہمیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیلی ہے۔اگر سلمیٰ کوئی گوشت پوست کی زندہ عورت ہوتی تو شاعر اُس سے اِتنی والہانہ محبّت کبھی نہ کرتا،مگر چونکہ وہ اُس کی اپنی تخلیق تھی اِس لیے وہ اُس سے بے پناہ محبّت کرتا تھا۔''(33)

سعادت حسن منٹو نے اپنی رائے کی تائید میں جو دلیل دی ہے اُس سے تو یہی اَ ثر اُبھرتا ہے کہ سلمیٰ، اختر کے ذہن کی اِختراع ہے۔اختر کو سلمیٰ (یہ نام اصلی نہیں) کے خطوط بھی آئے جیسے دیگر خواتین کے،مگر اِس میں رنگ آمیزی ساری اختر کی ہے۔

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں:

''اختر کی منظومات میں لائے جانے والے اسماء ''سلمیٰ''، ''ریحانہ''، ''عذرا'' وغیرہ میرے علم کی حد تک فرضی نام ہیں۔صرف تخیّل کی کارفرمائیاں ہیں۔یہ سب اُن کی ذہنی تخلیق ہیں۔آب وگِل کی دُنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں۔''(34)

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 18 (1,1)

اِس حوالے سے اُنھوں نے یہ دلیل دی ہے:

”اختر صاحب نے ابتدائی عمر میں عربوں کی تاریخ اور شاعری کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اُن کی کئی نظموں میں عربی ماحول جھلکتا ہے۔ یہ نام بھی عربی ادب سے اخذ کیے گئے تھے۔“(35)

اِس بات کو اختر کے دوست تسلیم کرتے ہیں کہ اختر کو لڑکیوں کے خطوط آتے تھے، اُن پر وہ نظمیں بھی لکھتے تھے مگر نام بدل دیتے تھے تا کہ اُن کی رُسوائی نہ ہو۔ اِس طرح ممکن ہے یہ نام اُنھوں نے عربی ادب ہی سے اخذ کیے ہوں۔ یعنی یہ بات مسلّمہ ہے کہ یہ نام اصل نہیں ہیں۔ حقیقت جو بھی ہے، اختر کا یہ قدم جرأت مندانہ اور قابل تعریف ہے کہ اُنھوں نے اُردو شاعری کی تاریخ میں محبوب کے لیے صیغۂ تانیث استعمال کر کے امرد پرستی کی نفی کی اور یہ کوئی معمولی قدم نہیں کہ عطار کے لونڈوں کی بجائے سلمیٰ اور عذرا کی جھلک دِکھائی دینے لگی۔

عاشق حسین بٹالوی نے سلمیٰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

”اِس نام (سلمیٰ) نے اختر کی ذات اور اُن کے کلام کے ساتھ بہت سی حکایتیں، روایتیں اور داستانیں وابستہ کر دی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اِس نام کی آڑ میں اپنا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا اور بعض ستم ظریف تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اختر صاحب جب رات کو سلمیٰ سے ملنے جاتے تھے تو وہ مکان کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے۔“(36)

اِس اقتباس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اِس نام کی آڑ میں یار لوگوں نے کیا کیا دعوے کیے اور اپنا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کی ہے۔ عاشق حسین بٹالوی مزید لکھتے ہیں:

”وہ لوگ جنھوں نے اختر و سلمیٰ کے عشق کی فرضی تفصیلات مرتّب کر ڈالی ہیں جو اختر کی شاعری کے خود ساختہ نقاد بن کر اِس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ فلاں نظم اختر نے اُس وقت لکھی جب سلمیٰ کا پہلا خط اُنھیں ملا تھا، ایک بہت بڑے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔“(37)

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 19 (1,1)

اور حقیقت یہ ہے کہ اِس ''اخلاقی جرم'' کا آغاز، عاشق حسین بٹالوی صاحب کے اپنے گھر یا دفتر ہی سے ہوا۔ اور سب سے پہلے خادم حسین بٹالوی صاحب نے قدم اُٹھایا، پھر حکیم نیّر واسطی نے ''سلمیٰ و اختر'' کی حیاتِ معاشقہ کو بیان کرنا ضروری سمجھا اور آخر میں ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اِن دونوں کتابوں سے فائدہ اُٹھایا اور اپنی تحقیق کے لیے اُنھیں بطور سند استعمال کیا۔

خادم حسین بٹالوی صاحب نے ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' نامی کتاب مرتّب فرمائی ہے۔ اِس کا مسودّہ اُنھوں نے کس طرح چُرایا؟ وہ کتاب کے پیشِ لفظ میں خود ہی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غالباً 1934ء کا زمانہ تھا۔ ماہنامہ ''رومان'' اختر شیرانی مرحوم اور برادرِ محترم عاشق حسین بٹالوی کی مشترکہ اِدارت میں نکل رہا تھا۔ (''رومان'' کا آغاز 1935ء میں ہوا۔ راقم) میں اُن دِنوں منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا۔ لاہور میں عمر گزارنے کے بعد منٹگمری کی زندگی بے کیف اور خشک تھی۔ چنانچہ جب بھی موقع ملتا، بھاگ کر لاہور آجاتا۔ اِسی دروان مَیں ایک دن ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ہاں گیا۔ وہ موجود نہ تھے۔ میں استحقاقِ برادرانہ کو کام میں لاتے ہوئے اُن کی چیزوں کو اُلٹنے پُلٹنے لگ گیا۔ میز کی دراز کھول کر دیکھی تو ایک کاپی پر نظر پڑی جس کے سرورق پر لکھا تھا ''شاعر کا خواب''۔ اُسے کھولا تو تحریر اختر مرحوم کی تھی اور یہ مسودہ مجموعہ تھا ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کا جس کو کتابی صورت دے دی گئی تھی۔ عاشق صاحب کی اطلاع یا اجازت کے بغیر وہ مسودّہ لے کر منٹگمری چلا گیا۔
>
> دو دِن اور ایک رات کی مسلسل محنت کے بعد یہ مسودّہ نقل ہوگیا۔ اس کے بعد میں لاہور آیا اور کاپی چپکے سے اُسی دراز میں رکھ دی۔ وقت گزرتا گیا اور مسودّہ میرے پاس محفوظ رہا۔
>
> 1947ء کے پُر آشوب زمانے میں جب ہر چیز درہم برہم ہوگئی تو یہ قیمتی متاع بھی کہیں گُم ہوگئی۔ ایک سال بعد اختر مرحوم بھی اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 20 (1,1)

دو سال کی مسلسل جستجو کے بعد وہ کاپی صحیح سالم مل گئی۔ (یہ قیمتی متاع کہاں گم ہوئی اور دو سال مسلسل اسے کہاں تلاش کرتے رہے اور کہاں سے ملی، اِس کی تفصیل موصوف نے نہیں لکھی۔ راقم)

اس کے بعد میں نے متعدد بار اس کی اشاعت کا اِرادہ کیا لیکن زندگی کی کش مکش نے مُہلت نہ دی۔۔۔۔۔۔ اب یہ ''مسروقہ مجموعہ'' آپ کے پیشِ نظر ہے۔ زندگی میں سرقہ کا مُرتکب تو کئی بار ہوا ہوں مگر اِس حسین سرقہ پر جو خوشی مجھے محسوس ہوتی ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔''(38)

یہ اقتباس طویل ہو گیا ہے، مگر اِس کے بغیر اِس کتاب کی اشاعت کی کہانی ادُھوری اور نامکمّل رہتی۔ خادم حسین بٹالوی صاحب، جو زندگی میں ''سرقہ'' کے عادی ہیں، اُنھوں نے یہ ''مسروقہ مجموعہ'' شائع کیا ہے اور اپنے اِس عمل پر شرمندہ ہونے کی بجائے خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

''کوکب'' (اختر) نے اِسے مرتّب کرتے ہوئے اِس کا نام ''شاعر کا خواب'' رکھا تھا۔ یہ ''شاعر کا خواب'' تھا اور وہ بھی شاعرِ رومان، اختر شیرانی کا۔ یہ بڑا رنگین اور حسین خواب ہے مگر جب خادم حسین بٹالوی صاحب نے اسے ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کا نام دیا تو پھر قاری اسے خواب کی بجائے حقیقت سمجھ بیٹھا۔ مزید کرم نوازی حکیم نیّر واسطی صاحب نے کی اور ''سلمیٰ و اختر'' کے نام سے اختر کی حیاتِ معاشقہ بیان کر دی۔ گویا حکیم نیّر واسطی صاحب اور خادم حسین بٹالوی صاحب نے ایک خواب کو حقیقت کا رنگ دے دیا اور ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اِن مذکورہ کتابوں کو اپنی تحقیق کی بُنیاد بنا لیا اور انھیں بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ یوں کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہی۔ خطوط کے بارے خادم حسین بٹالوی کا کہنا ہے کہ:

''اُن کے متعلق مختلف آراء ہیں۔

1۔ بعض لوگ سرے سے سلمیٰ کے وجود ہی سے مُنکر ہیں اور اُن کی رائے میں اِن خطوط کی اِسی قدر حقیقت ہے کہ:

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 21 (1,1)

اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

2۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ سلمیٰ واقعی ایک حقیقت تھی اور اختر مرحوم کے ساتھ اُس کا معاشقہ بھی مسلّم تھا لیکن وہ کوئی ادیبہ نہ تھی کہ اِس قسم کی بلند پایہ عبارات لکھ سکتی، لہٰذا یہ خطوط اختر مرحوم نے خود ہی لکھے تھے۔

3۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اِن خطوط کو واقعی اصلی خیال کرتے ہیں۔"(39)

ان تین گروہوں میں بٹے ہوئے لوگ کون ہیں اور ان کی یہ رائے کب اور کہاں سامنے آئی، جناب خادم حسین بٹالوی صاحب نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور اپنی طرف سے خطوط کے اصل ہونے کے یہ دلائل خود دیے ہیں۔

1۔ خطوط پڑھنے کے بعد یہ کہنا کہ یہ سب خود فریبی تھی جس میں اختر مُبتلا تھے، بہت مشکل ہے۔ اِس قدر طویل خود فریبی ممکن نہیں۔

2۔ خطوط میں اکثر مقامات پر بعض گھریلو اور دیگر واقعات کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے کہ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط اصلی ہیں۔"(40)

یہ دونوں دلائل اِتنے مضبوط نہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خود فریبی نہیں بلکہ خواب ہے اور ایک رنگین خواب ہے اور پھر اِن خطوط میں گھریلو واقعات کی رنگ آمیزی سے حقیقت کے قریب ہو گئے ہیں۔ یعنی ایسا خواب جس میں حقیقت کی جھلکیاں بھی ہیں۔ اور پھر خادم حسین بٹالوی صاحب خود بھی کہہ رہے ہیں:

"اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ادبی شہ پارے اختر و سلمیٰ کے اصل یا فرضی" محبّت کے ان مٹ نقوش ہیں جن کو ادب میں بلند جگہ ملنی چاہیے۔"(41)

یعنی مؤلّف کو خود بھی علم نہیں کہ محبّت اصل ہے یا فرضی، مگر اُن کی یہ رائے درست ہے کہ یہ خطوط بلا شبہ ادبی شہ پارے ہیں۔

عاشق حسین بٹالوی صاحب نے اپنے "خاکے" میں اُس "کاپی" کا (جسے خادم حسین بٹالوی نے اُن کے دفتر سے چرایا تھا) ذکر کیا ہے جو اختر شیرانی نے عاشق حسین بٹالوی کو ملاحظہ

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 22 (1,1)

کے لیے دی جو اُنھوں نے ”شاعر کا خواب“ کے نام سے مرتّب کر رکھی تھی، اور اُسے اپنی ”حیاتِ معاشقہ“ کی مکمّل داستان کہتے تھے۔ بہ قول اختر شیرانی:

> ”اِس میں میرے اور سلمیٰ کے تمام خطوط موجود ہیں۔ اخفائے راز کے لیے میں نے اپنا نام ”کوکب“ رکھا ہے۔“(42)

اختر شیرانی کی حیاتِ معاشقہ کی داستان جو اُنھوں نے ”شاعر کا خواب“ کے نام سے مرتب کی تھی اُس بارے عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ:

> ”میں نے بمشکل چند صفحے پڑھے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ ”کوکب“ اور سلمیٰ کے خطوط لکھنے والی ایک ہی ہستی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجّب ہوا کہ جو خط سلمیٰ سے منسوب کیے گئے تھے وہ تمام تر اختر کے اپنے لکھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ”شاعر کا خواب“ سراسر اختر کے اپنے قلم کا مرہونِ منت ہے۔“(43)

عاشق حسین بٹالوی صاحب کے اِس بیان کے باوجود یہ بات ابھی تک اُلجھی ہوئی ہے کہ خطوط سلمیٰ کے ہیں یا اختر کے اپنے لکھے ہوئے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ”اختر و سلمیٰ کے خطوط“ کا مطالعہ ضروری ہے (جسے خادم حسین بٹالوی صاحب نے ”شاعر کا خواب“ کا مسودّہ چرا کر اِس نام سے مرتّب کیا ہے)۔ کتاب کا آغاز سلمیٰ کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں جو پہلا خط سلمیٰ کی طرف سے موصول ہوا ہے اُس کا عُنوان تجویز کیا گیا ہے: ”بہارستان“ کی ڈاک میں ایک گمنام تحریر۔“

خط کا آغاز اِن اشعار سے ہوتا ہے: ؎

عشق ہے اور ابتدائے آہ ہوتی ہے
مبارک آج طفل دل کی بسم اللہ ہوتی ہے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 23 (1,1)

اِن اشعار کے بعد محبت کا ذکر کچھ اِس طرح سے ہے:

''اگر محبّت واقعی نام ہے ایک قوتِ جاذبہ کا۔۔۔۔۔۔۔اگر فریفتگیٔ عشق سچ مُچ کہتے ہیں۔۔۔۔۔اِک کشش پنہاں کو! اگر شگفتگیٔ نیاز عنوان ہے حقیقتاً ایک فوری اثر انگیزی کا! تو۔۔۔۔۔۔اے صرفِ تغافل، اے محوِ بے نیازیٔ مطلق، تیری نگاہِ التفات نے اب تک درسِ بیداری کیوں نہ لیا، تیری روح کے خوابیدہ ءاَثرات نے اب تک کیوں انگڑائی نہ لی۔ تیرے افکارِ روحی کی رنگینیوں میں اب تک کیوں نہ محبّت کی گُدگُدی پیدا ہوئی؟''

آپ کے رسالے کے ہزار ہا خریدار ہوں گے مگر اِس ہجوم میں۔۔۔۔۔۔صرف میں ہی وہ خریدار ہوں جو اپنی نادانیٔ جذبات کی بدولت اپنے آپ کو آپ کا خریدار سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔۔آہ۔

ایک مدت تک دلِ غمگین کو سمجھاتے رہے
الغرض سو سو طرح سے دل کو بہلاتے رہے

۔۔۔۔۔۔۔

اب مگر چلتا نہیں دل پر فریبِ آرزو
یوں تو ہم کھایا کیے ، اکثر فریبِ آرزو

بذریعہ ''بہارستان'' جواب دیجئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔راز داری کی تاکید۔

والسّلام
ایک پردہ نشین۔۔۔۔۔مگر
مجبور

دوشیزہ''(44)

محترمہ کا یہ پہلا خط ہے جو گمنام ہے، مگر اظہارِ عشق ہے مگر فریق ثانی سے خوابیدہ ءاَثرات کے اب تک انگڑائی نہ لینے کا شِکوہ بھی۔ اِس کے ساتھ مرصّع عبارت کی دلکشی بھی دامن دل کو کھینچتی ہے۔ کتاب میں اِس خط کے بعد ''بہارستان'' کے شمارہ نومبر 1926ء میں اِس گمنام خط

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 24 (1,1)

پر تبصرے سے اقتباس ہے:

''اِس تحریر کو بھی ایک خاتون کے نقوشِ قلم سے فیض یاب ہونے کا دعویٰ ہے۔ لیکن درحقیقت اِس کے پردہ میں ایک ''ریشائل'' چہرہ جلوہ فرما ہے۔ اِظہارِ غُصّہ بُری چیز ہے وگرنہ ہمیں صاف کہنا چاہیے کہ اگر ہمارے سامنے ہوتو ہم سے بے اختیارانہ ''مُنہ نوچنے'' کا جرم سرزد ہوجائے۔''

اقتباس از ''بہارستان'' نومبر 1926ء (45)

یعنی اختر کو شبہ ہی نہیں، یقین ہے کہ عورت کے پردے میں کوئی مرد یہ خط لکھ رہا ہے۔
اِس سے آگے ندر سجاد حیدر کے ایک مضمون کا اِقتباس ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

''ہمارے نوجوان باہمت بھائی اختر صاحب شیرانی نے اپنے رسالہ ''بہارستان'' میں یہ باریک پردہ اُلٹا دیا اور ان ادبی مضامین نگارِ بُرقعہ پوش حضرات کے نقاب اُلٹ دیے۔ انھوں نے کسی تازہ اشاعتِ ''بہارستان'' میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ ہم پر یہ جادو نہ چلے گا۔ ہم نے بخوبی جان لیا ہے کہ اِس زنانہ شاعرانہ نام کے برقعہ کے اندر کون ہے۔''

(ہندوستان کی کم علم مضامین نویس خواتین)

از ندر سجاد حیدر

مرقع ماہِ دسمبر 1926ء (46)

کتاب میں موجود نہیں ہے مگر لگتا ہے کہ سلمیٰ کا کوئی اور خط آیا ہے جس کے جواب میں کوکب کا خط ہے، جس میں اُنھوں نے صاف اپنی بے یقینی اور بے اعتباری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آپ کو مجھ سے میری ''نا آشنائی رحم'' کا شِکوہ ہے۔۔۔۔۔ مگر جب مجھے سرے سے اس ''تھیٹر'' کی سی فریب آرایانہ اور محض ستم ظریفانہ تناظر پر اعتماد نہ ہوتو آپ ہی انصاف کیجئے! میں اِن گلے شِکوؤں کا کیا جواب دوں؟'' (47)

اختر کو ابھی تک اِس فریب آرایانہ اور ستم ظریفانہ مناظر پر اعتماد ہی نہیں۔ یہ خطوط

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 25 (1,1)

1926ء کے اواخر کے ہیں۔ اختر صاحب کو اِن خطوط پر نہ اعتماد ہے اور نہ یقین کہ یہ کسی خاتون کے ہیں (خاتون ابھی تک گمنام ہے، اپنا نام اور پتا ظاہر نہیں کیا)۔ اختر صاحب اِن خطوط کو عورت کی بجائے مرد کے سمجھ رہے ہیں اور اِسی اثنا میں اختر صاحب کی شادی ہو جاتی ہے۔ مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''دسمبر 1926ء کی کرسمس کی تعطیلات میں وہ (حافظ محمود شیرانی) اپنے بیٹے محمد داؤد خاں (اختر شیرانی) کی شادی کے لیے مارواڑ گئے۔ اختر صاحب کی نسبت حافظ صاحب کے چھوٹے چچا یعقوب خاں کی نواسی سے ہوئی تھی جو محمد احمد خاں شیرانی کی دُختر تھیں۔ حُرمت بانو نام تھا۔''(48)

مگر حکیم نیّر واسطی صاحب جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ:

''اختر کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے اکثر لمحات میرے ساتھ بسر ہوئے اور وہ بیشتر سوانح اور حوادث جو سلمیٰ کے عشق اور اُن کی رومانی زندگی میں اُن کی نظموں کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں، میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔''(49)

وہ اختر کی حیاتِ معاشقہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اختر کے عشق کی ابتداء سلمیٰ کے ایک مکتوبِ محبّت سے ہوئی جو اُنھوں نے اُن کے ''خیالستان'' (خیالستان نہیں ''بہارستان'') میں اُن کی تصویر سے متأثر ہو کر لکھا تھا جس میں اختر فکرِ شعر میں ایک عجیب عالم محویت میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ اختر کے نام سلمیٰ نے اپنا یہ سب سے پہلا مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے قصداً اپنا مکمل پتہ نہیں لکھا تھا۔ مگر اس خط کو پڑھ کر وہ دیوانہ ہو گئے اور نتیجہ اب اس کا یہ تھا کہ اپنے محبوبِ لامکاں کے عرش کا پتہ معلوم نہ ہونے کے باوجود ایک دیوانگی تھی جو اختر کو اُس کی تلاش میں کشاں کشاں لیے پھرتی تھی۔ چنانچہ شاعر کا مشغلۂ حیات اب یہ تھا کہ وہ نامۂ محبوب کو سینے سے لگائے دن بھر اُس کی تلاش میں اپنے خیالوں میں مست دُنیا اور دُنیا والوں کے طعن ہائے رُسوائی سے بے نیاز شہر کے ہر کوچہ و برزن کی خاک چھانتا تھا۔ وہ شہرِ جاناں میں درِ جاناں پر جبیں سائی کے لیے ہر سنگِ

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 26 (1,1)

آستاں پر جھکتا اور ہر در و بام کو حیرت و حسرت سے دیکھتا۔"(50)

نیّر واسطی صاحب نے اِس پہلے نامعلوم اور گمنام خط کے بعد اختر کے اس نادیدہ محبوب سے عشق اور عشق میں جنوں کی کیفیت اور حالت پر ایک طویل مضمون باندھا ہے اور یہ مضمون بڑا جذباتی ہے اور اِس کے ایک ایک لفظ سے اختر کی حالتِ جنوں اور کیفیت عیاں ہے اور حکیم نیّر واسطی کے حُسنِ بیان کا اعجاز ہے۔ یہ واقعات 1926ء کے اواخر اور 1927ء کے شروع سے تعلق رکھتے ہیں۔ستم یہ ہے کہ اُس وقت تک حکیم صاحب سے اختر کی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اُن کی باقاعدہ ملاقات اپریل 1932ء میں ہوئی۔ اِس ملاقات بارے عاشق حسین بٹالوی بیان کرتے ہیں:

"اپریل 1932ء کا ذکر ہے ایک روز اختر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ "میرا بچّہ بیمار ہے اور بیوی کا اصرار ہے کہ حکیم نیّر واسطی اُسے آ کر دیکھیں۔ آپ حکیم صاحب کے بہت دوست ہیں چل کر حکیم صاحب کو لائیے۔ میں نے سنا ہے وہ کسی مریض کو دیکھنے اُس کے مکان پر نہیں جاتے۔"
میں نے پوچھا "آپ کی حکیم صاحب سے شناسائی نہیں ہے کیا؟"
بولے "میں صرف ایک بار اُن سے ملا ہوں۔۔۔۔۔"
میں اور اختر اُس شام حکیم صاحب کے دولت کدے پر چونے منڈی میں حاضر ہوئے۔۔۔۔اس کے بعد اختر اور حکیم صاحب کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے جو روز بروز استوار ہوتے گئے۔"(51)

اِس اِقتباس سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اختر اور حکیم صاحب کا تعلق اپریل 1932ء میں قائم ہوا اور پھر جس طرح حکیم صاحب نے اختر کا ساتھ دیا اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں مگر تعجّب محض اِس بات پر ہے کہ وہ 1926, 1927ء کے واقعات بھی اِس طرح بیان کر رہے جیسے وہ اختر کے پاس ہوں، کیفیت خود دیکھ رہے اور محرم راز ہوں۔ حکیم صاحب مزید لکھتے ہیں:

"اِسی طرح بہت سی راتیں بسر ہو چکی تھیں اور اب مہینے گزر چکے تھے کہ سلمیٰ کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔۔۔آخر حُسن کو عشق کی بے بسی اور بے چارگی پر اَب رحم آ گیا

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 27 (1,1)

ِیعنی سلمیٰ نے بارِ دِگر اختر کو اپنے محبّت نامہ سے نوازا۔۔۔ یہ خط ایک رنگین اور عطر بیز لفافے میں مستور تھا۔ایک معصوم اور ننھا قاصد اس کو لایا تھا۔۔۔۔ اِس مرتبہ اس محبّت نامۂ شمامہ میں منزلِ جاناں کا پورا پتہ زینتِ سرِ قرطاس تھا۔آہ وہ منزلِ جاناں اور وہ۔۔۔۔حریمِ ناز جس میں ایک شمع بے پروانہ جل رہی تھی۔"(52)

اپنے اِس پہلے باقاعدہ خط میں سلمیٰ نے جہاں اپنی محبّت کا اِظہار کیا وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''میرے خط نہ لکھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں خدانخواستہ کسی اور خیال میں محو تھی بلکہ اِس کا باعث یہ تھا کہ میں ''آپ کی نو عروسانہ خلوت و جلوت'' میں مخل ہونا نہیں چاہتی تھی۔''(53)

یعنی پہلا باقاعدہ خط جس میں اپنا نام اور پتہ بتایا گیا ہے، اُس وقت لکھا جب اختر کی شادی ہو چکی تھی اور نادیدہ محبوب کو اس کی خبر بھی تھی۔اپنی محبّت کے بارے یوں لکھتی ہیں:

''دو سال کی طویل اور رُوح فرسا،مُدت سے غم ہائے محبّت سہتے سہتے میری حالت یہ ہوگئی ہے کہ: ؎

صورت میں خیال رہ گئی ہوں

(54)

اِس کے بعد سلمیٰ کا دوسرا خط ہے جس میں اُس نے یہ تحریر کیا ہے کہ:

''آپ کی ''دل خراش طنزوں'' سے متأثر ہو کر میں نے آپ کے اِس قول پر عمل پیرا ہونے کا عہد کر لیا ہے کہ ''محبّت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ محبّت ہے۔ خواہ اس کا علم فریق ثانی کو ہو یا نہ ہو'' اور یہ کہ سچی محبّت کو جوابی محبت سے بے نیاز ہونا چاہیے۔''(54-A)

اِس تمہید کے بعد اپنے عریضہ کا جواب عنایت فرمانے کی گزارش کی ہے اور کچھ سوالات کے جوابات بھی مانگے گئے ہیں۔جن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ:

''کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو میری ''غیر فانی اور بے غرض محبّت'' کا اب تک یقین نہیں آیا اور آپ اِسے محض ایک فریب سمجھتے ہیں۔''(55)

اِس کے جواب میں کوکب نے جو خط لکھا ہے اُس میں دل کھول کر رکھ دیا ہے۔اس

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 28 (1,1)

میں احساسات و جذبات کا اِظہار بھی ہے اور اعتراف محبّت بھی۔ اور اپنی شادی (اختر کی) ہو جانے کے باعث سلمیٰ کو حاصل نہ کرنے کا ملال بھی۔ اور اِس سلسلے میں والدین کا جو کردار اور اختیار ہے سخت ترین الفاظ میں اس کا شکوہ بھی۔ اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جذبات لطیفہ کی غارت گری، محبّت پرست روحوں کی یہ بربادی سب سے زیادہ جس چیز کی گِلہ مند ہے وہ ہمارے والدین کی حماقتیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔ہماری معاشرت کے دامن پر سب سے زیادہ نمایاں جو ہماری بد نصیبیوں کی تکمیل کی مُہر بنا ہوا ہے، والدین کا وہ ناجائز اختیار ہے جو اُن کو اپنی ہوش مند اولاد کے ازدواجی معاملات میں حاصل ہے۔۔۔۔۔۔۔ کتنے رقیق وصمیم جذبات ہیں جو والدین کے ظالمانہ اختیار کی اُلٹی چُھری سے چُپ چاپ ذبح ہو جاتے ہیں اور دم نہیں مارتے۔ کس درجہ لطیف و نازک افکار ہیں جو والدین کے اِس ملعون، اِس وحشیانہ، اِس شیطانی اختیار کے مذبح میں، مقتل میں ہر وقت، ہر لمحہ ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔'' (56)

والدین کے اِن غیر آئینی، غیر اصولی، غیر شرعی اور شیطانی اختیار کا تذکرہ اپنی شادی کے جواز یا مجبوری کی وضاحت کے لیے ہے۔ اس کے بعد شدید غم کا اِظہار ہے کہ اب سلمیٰ کا حصول ناممکن ہوگیا ہے۔ اور آخر میں پہلی اور آخری ملاقات کی اِلتجا ہے۔ لکھتے ہیں:

''کیا میری محبّت کو اِتنا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ عمر بھر میں پہلی اور آخری مرتبہ تمھارے چند روحی لمحے طلب کر سکے۔۔۔۔۔۔ چند لمحے، اِتنی مُہلت، آہ! بس اِتنی مُہلت کہ میں تمھارے قدموں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں مل کر اپنے دل کو تسکین دے سکوں۔'' (57)

اِس فسانۂ دردوغم اور داستانِ حسرت و اَلَم کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہے کہ:

''میں تم سے ملنے کی پہلی اور آخری مرتبہ ملنے کی کوشش کروں گی۔'' مگر ساتھ ہی یہ بتانا بھی ضروری سمجھتی ہے کہ ''میری عمر کے ان 16 سالوں میں یقین جانیے کہ یہ سب سے پہلی مرتبہ، سب سے پہلا اتفاق ہے کہ میں آپ سے اور صرف آپ سے ملنے کا وعدہ کر رہی ہوں، اِس حال میں کہ ''ناجائز ملاقات'' کے لیے میرا ضمیر

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 29 (1,1)

مجھ پر لعنت کر رہا ہے۔۔۔۔۔اِس کشمکش انگیز حالت میں بھی اپنی اور آپ کی ایک طویل عرصہ کی بے تاب آرزوؤں ، بے صبر ارمانوں اور بے قرار حسرتوں کی خاطر اپنے ایفائے عہد میں ثابت قدم رہوں گی۔۔۔۔۔۔۔پرسوں 27 جنوری (غالباً 1927ء) جمعہ کے دن ٹھیک ایک بجے شب کو میں آپ کی قدم بوسی کے اِشتیاق میں مضطرب و بے تاب ہوں گی۔‘‘(58)

یہ خط پا کر اختر پر کیا گزری، اِس رنگین داستان کو حکیم نیّر واسطی نے بڑے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ملاقات سے پہلے کی کیفیت، ملاقات اور ملاقات میں حُسن و عشق کا والہانہ انداز اور شبِ وصل کے بعد اختر کی کیفیت اور حالت، یہ ساری کہانی حکیم صاحب نے بڑے چسکے لے کر بیان کی ہے اور اختر کی شادی اور نظموں کے حوالے اور پس منظر بیان کیا ہے۔اپنے اسی خط میں سلمیٰ نے یہ بھی گلہ کیا ہے کہ:

’’اگر آپ چاہتے ،اِک ذرا سی کوشش کرتے تو میں آپ کو مل جاتی یا دوسرے لفظوں میں آپ مجھے پالیتے۔آہ! نہایت آسانی کے ساتھ پا سکتے تھے مگر آپ نے تو۔۔۔۔۔لیکن میں بے وقوف ہوں۔‘‘(59)

حکیم نیّر واسطی صاحب نے بھی اِسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

’’اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جا سکتا تھا لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا۔‘‘(60)

رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہونے کی وجہ حکیم نیّر واسطی صاحب نے نہیں لکھی البتہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب بیان کرتے ہیں:

’’اختر شادی شدہ تھے۔محمود صاحب (حافظ محمود شیرانی) کی بھانجی حُرمت بانو سے اُن کی شادی ہو چکی تھی اور اب محمود صاحب اس کو کسی طرح گوارا نہ کرتے کہ اُن کے ہوتے ہوئے اختر کو دوسری شادی کی اجازت دیں۔اختر اپنی تمام بے راہ رویوں کے باوجود اپنے والد کا بڑا احترام کرتے تھے، اُن سے ڈرتے تھے اور کوئی ایسی بات زبان سے نکالنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے جو اُن کے مزاج

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 30 (1,1)

کے خلاف ہو۔"(61)

اختر شیرانی والدین کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے بھی محبّت اور شادی بارے اپنا ایک واضح مؤقف رکھتے ہیں ۔وہ (کوکب) اِس حوالے سے اپنے خیالات اور جذبات کا اِظہار یوں کرتے ہیں:

"محبّت حقیقتاً جذبات شباب کی دراز دستیوں سے بلند، ایک غیر مرئی احساس ہے، ایک ملکوتی جذبہ ہے، ایک فردوسی شگفتگی ہے، ایک آسمانی نغمہ ہے، جو کبھی نفسانی اغراض کے پیکر میں نہیں سما سکتا۔ الحمدللہ کہ میرا دل مطمئن ہے، میری روح ایک بچے کی طرح شاد، ایک نوشگفتہ کلی کی طرح شاداب ہے اور میرے جذبات پُرسکون۔ایک ملکوتی خواب کی طرح پُرسکون، سلمیٰ کی معصومیت۔آہ، اُس کی معصوم رعنائی یوسف کا دامن نہیں بن سکتی، میرے شباب کے طوفانی ولولے زلیخا کا ہاتھ نہیں بنیں گے۔فرشتوں کے تقدّس کی، حوروں کی پارسائی کی، کلیوں کی معصومیت کی، نغموں کی دوشیزگی کی، بچوں کی مسکراہٹ کی قسم مجھے اُس کا بھول کر بھی خیال نہیں آیا۔"(62)

سلیم احمد کو اِس ملکوتی جذبے پر سخت اعتراض ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"اختر کے نزدیک فطرت ایک سچ ہے جس پر آدھے دھڑ کی عورت کے ساتھ لپٹ کر وہ ملاقات کرتا ہے مگر اِس شرط کے ساتھ کہ اس کی تقدیس ملکوتیت اور پاکیزگی پر آنچ نہ آنے پائے، دراصل ایک مخصوص تناظر میں اُن کے کسری آدمی (ادھورا آدمی) کے تصوّر کی نمائندگی کرتا ہے۔"

سلیم احمد کے اِس اعتراض کا بڑا مدلّل جواب ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"سلیم احمد نے اِس نُکتے کو نظر انداز کر دیا کہ اختر فطرت کے تقدّس کا قائل ہے اور عورت اُس کے ہاں فطرت کا ایک مظہر ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں عورت کی سراپا نگاری اور رومان پرور جذبات کے بیان میں جنسیت اور شہوت منہا ہو جاتی ہے۔ اختر کے ہاں مرد/ انسان فاعل ہے اور عورت/فطرت مفعول

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 31 (1,1)

ہے۔یعنی محبّت کیے جانے کے قابل ایک معروض۔ یہاں مرد یا انسان عورت یا فطرت کا اِستحصال نہیں کرتا، اس سے محبّت کرتا ہے۔ یہ مرد اورعورت یا انسان اور فطرت کے رِشتے کی ایک مثالی تعبیر ہے۔‘‘(63)

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کی اِس سلسلے میں رائے یہ ہے کہ:

’’رومانی طرزِ فکر نے اُن کی قوتِ عمل مفقود کر دی تھی۔ وہ صرف خیال کی دُنیا میں رہتے تھے،عمل سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ویسے بھی وہ شادی کو شباب کے لیے غارت گراور اس کی معصومیت کے لیے سم قاتل سمجھتے تھے۔‘‘(64)

اِن باتوں کو مدِّ نظر رکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سلمیٰ کو حاصل کرنا، رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا، اختر کی ترجیح میں شامل ہی نہیں تھا۔حُسن کی غارت گری اُسے قبول ہی نہیں تھی۔اس کی محبت تو انسان اور فطرت کے رِشتے کی ایک مثالی تعبیر ہے۔اور اِس کہانی کو ’’شاعر کا خواب‘‘ قرار دے کر رنگین بھی بنایا ہے اور مثالی تھی۔

شبِ وصل کے بعد کوکب صاحب نے جو خط لکھا ہے، اُس میں اپنے دردِ فراق اور دل کی بے تابی کے بڑھ جانے کا ذکر ہے اور وصل کے لمحوں میں محبّت کے نشوں میں سرشار ہونے کی کہانی بھی تحریر کی ہے۔کوکب صاحب لکھتے ہیں:

’’میں سوچتا ہوں کہ اُس رات جو موجِ رنگ و بُو میرے سر سے گزری وہ کوئی پُر فریب خواب نہ ہو؟ مگر میرے گستاخ ہونٹوں کی حلاوت ، وہ حلاوت جو انھوں نے تمھارے گلاب کی سی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں سے چھینی تھی، مجھے کہتی ہے کہ یہ خواب نہ تھا۔‘‘(65)

اپنی اِس زیادتی یا گستاخی اور سلمیٰ کی خفگی کا ذکر بھی ہے۔لکھتے ہیں:

’’میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے کچھ بدگمان یا خفا ہوگئی ہیں۔خفگی کی تو میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا سوائے اُس رات میرے ہونٹوں نے دو ایک گُستاخیاں کرنے کی جسارت ضرور کی تھی! اگر یہ بات ہے تو میں آپ سے ہزار بار معافی چاہتا ہوں اور آئندہ ملاقات میں آپ دیکھ لیں گی کہ میں اِس معاملہ میں کس قدر ضبط کر سکتا

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 32 (1,1)

ہوں ۔۔۔۔۔لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں نے فضا کی ''جذبات انگیز'' حالت کے باوجود اس سے آگے بڑھنے کی جُرأت نہ کی، تو کیا آپ میری محبّت، محبّت کی معصومیت، اِس کی ملکوتی اور مقدّس حیثیت کی داد نہیں دیں گی؟ کیا اب بھی مجھ سے شکایت ہوگی کہ مجھے آپ کی ناموس کا پاس نہیں۔''

اِس خط کی پشت پر سلمیٰ نے لکھا ہے:

''میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ آپ اِنسان نہیں ایک ''دیوتا'' ہیں اور آپ کی اِس دیویت کی شان نے مجھے خرید لیا ہے۔''(66)

خط میں اِس بات کا بھی انکشاف ہے کہ کوکب صاحب نے سلمیٰ سے اپنے خطوط واپس طلب کیے ہیں اور سلمیٰ نے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کے خطوط بھی واپس کیے جائیں۔کوکب خطوط کی ایسی واپسی کو ''بنیے پن'' سے تعبیر کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے خطوط ''ناول'' کے لیے طلب کیے ہیں۔یعنی وہ ان خطوط سے کوئی ناول لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ''شاعر کا خواب'' کے نام پر منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں۔سلمیٰ اِس پر اپنے سخت ردِّعمل کا اِظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''آپ کو کون سا حق حاصل ہے کہ آپ میری بے اختیارانہ اُفتادگیوں اور اپنے بے رحمانہ طرزِعمل کو ''ایک شاعر کا خواب'' بنا کر منظرِ عام پر لائیں اور فضائے عالم میں مجھے جی کھول کر رُسوا کریں۔۔۔۔۔میں التجا کرتی ہوں کہ مہربانی کر کے ''شاعر کے خواب'' میں میرے خطوط نہ نقل کیجئے۔خواہ وہ سلمیٰ ہی کے نام سے کیوں نہ ہوں۔میں آپ کی منتیں کرتی ہوں کہ ہرگز نقل نہ کیجیے۔علاوہ بریں ''فسانہ'' اِس انداز میں لکھیے کہ ناظرین پر حقیقت منکشف نہ ہونے پائے۔''(67)

اِس کے بعد ایک اور خط میں اِس بات کا اِظہار کرتی ہیں:

''یقین فرمائیے کہ مجھے اپنے خطوط کے بارے میں آپ سے کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔۔۔۔۔بخدا مجھے آپ پر، آپ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہے۔آپ کی شرافت ونجابت پر اعتماد ہے۔یقیناً آپ میری عزت وآبرو کا اِتنا ہی پاس ولحاظ

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 33 (1,1)

رکھیں گے جتنا ایک بھائی اپنی بہن کا رکھ سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری محبّت (جو مجھے آپ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی) عام محبتوں سے بالکل علیحدہ ہے"(68)

ایک اور خط میں سلمیٰ نے اپنے خدشے کا اِظہار یوں کیا ہے:

"زبانی جمع خرچ اور لفّاظی سے احتراز کیجیے اور کوئی عملی ثبوت دیجئے۔ ہاں میں عملی ثبوت چاہتی ہوں اور وہ ۔۔۔۔۔ وہ صرف یہ ہے کہ اپنی سلمیٰ کو آنے والی رُسوائیوں اور بدنامیوں سے بچائیے کہ کہیں غریب گنہگار، گناہِ بے لذّت کی مصداق بن کر نہ رہ جائے۔ اِس خیال نے مجھے اندیشوں کے بحرِ عمیق میں غرق کر رکھا ہے۔ آپ، نہیں، توبہ۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ آپ کی وہ راز داں ہستیاں عنقریب کوئی فتنہ برپا کرنے والی ہیں۔"(69)

سلمیٰ کے یہ خدشات صحیح ثابت ہوئے اور "شاعر کے خواب" کی کیا کیا تعبیریں ہوتی رہیں اور یار لوگوں نے کیا کیا کہانیاں گھڑلیں۔

بہرحال "ملکوتی معصومیت" سے مملو ملاقاتیں بھی جاری رہیں۔ خط وکتابت بھی ہوتی رہی، حالِ دل بھی بیان ہوتا رہا اور گلے شِکوے بھی۔ آخر کار 1933ء کو اِس محبّت کا ڈراپ سین ہوا۔ سلمیٰ کی شادی ہوگئی۔ شادی کی خبر، شادی کا دِن اور پھر شادی کے بعد ملاقات اور اُس کے بعد اختر کی زندگی کے شب و روز، اِس کی تفصیل نیّر واسطی صاحب نے بیان کرتے ہوئے زورِ قلم صَرف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اختر کو جب خبر ہوئی کہ سلمیٰ طوعاً و کرہاً کہیں سلسلہ از دواج میں منسلک کی جارہی ہیں تو اُن دِنوں اُن کی حالت اِس قدر غیر ہوگئی تھی کہ وہ غم سے نڈھال ۔۔۔۔۔ دیوانہ وار دن بھر اِدھر اُدھر پھرتے اور رات بھر تڑپ تڑپ کر صبح کرتے ۔۔۔۔۔ اور اِس اثنا میں کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ اُنھوں نے مختلف ذرائع سے خودکشی کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ چھت کی بلندی سے گر کر مرنے کی سعی کی ۔۔۔۔۔ سلمیٰ کو جب اِن حالات کا پتہ چلا کہ میرا "شاعر" مرنے کی تیاری کر رہا ہے تو اُنھوں نے ضروری سمجھا کہ اختر کو خودکشی سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے ان کو بلایا ۔۔۔۔۔ سلمیٰ سراپا سوز وگداز بن کر زار زار

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 34 (1,1)

رونے لگیں اور ادھر اختر بھی سلمیٰ کے قدموں پر سر رکھ کر کچھ اِس طرح روئے کہ بے تاب ہو گئے۔ دونوں پر دیر تک یہ حالت طاری رہی۔۔۔۔۔اس کے بعد سلمیٰ نے اختر کو گلے سے لگایا۔ دیر تک اُن کا مُنہ دیکھا اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے ایک حسرت ناک آواز میں اُن سے مخاطب ہو کر کہا" اختر! جاؤ اب تم اور ہم حشر کے دن ملیں گے۔" اختر پر یہ آواز برقِ بلا بن کر گری۔ وہ بے چین اور بے قرار ہو کر فرشِ خاک پر گر پڑے۔۔۔۔۔"(70)

"سلمیٰ کی شادی کی رات اختر کے لیے ایک قیامت کا دن تھا۔ اُس رات اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ کبھی اُٹھتے اور دیوار سے سر پھوڑنے لگتے، کبھی بھاگتے اور چھت سے چھلانگ لگانے کی کوشش کرتے۔"(71)

سلمیٰ کی شادی ہوئے اب مُدّت ہو چکی تھی اور وہ اب اپنے گھر بار کی ہو چکی تھی اور اُس سے ملنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی، مگر اختر ہر وقت سلمیٰ کو یاد کرتے، رات بھر اُس کی یاد میں روتے اور دن بھر اُن کے حسین تصوّر کی رنگینیوں میں محو رہتے۔ بس اُس کی یاد ہی میں تڑپتے تھے۔ سلمیٰ کو جب اختر کی اِن لیل ونہار کی جان کاہ بے قراریوں کا علم ہوا اور اُنھوں نے سنا کہ اختر اِس طرح جلد از جلد اپنی زندگی ختم کرنے کا اِرادہ کر چکے ہیں تو اُنھوں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار اور اختر کو بلا کر اِس سلسلے میں اُن سے گفتگو کی جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے اختر کو گجرات کی ایک وادی میں پھر ملاقات کی دعوت دی۔ اِس ملاقات کا حال حکیم نیّر واسطی نے یوں بیان کیا ہے:

"سلمیٰ نے اختر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا:" اختر! مجھے تمھاری بے تابیوں اور بے قراریوں اور اِس زندگی سے بے زاری کا حال معلوم ہے۔ اور تم یقین کرو میں بھی تمھاری طرح مضطرو بے قرار ہوں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اِس دُنیا میں اِس دُنیا کی چند روزہ زندگی گزارنے کے لیے جبراً اِن حالات میں اسیر کر دی گئی ہوں اور اب میرے نسبی ننگ و ناموس کا تقاضا یہ ہے کہ میں جس آزمائش میں مبتلا کر دی گئی ہوں پوری ذمہ داری اور صبر و اِستقامت کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہو جاؤں اور جس

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 35 (1,1)

طرح ہو سکے یہ وقت گزار دوں۔ پس تم یقین کرو کہ یہ دُنیا کی زندگی چند روزہ ہے۔ اِس کے بعد تم اور ہم ان شاء اللہ حشر میں ملیں گے۔۔۔۔۔۔۔ اُس وقت کا انتظار کرو جب تم اور ہم ایک جگہ بہشت کی وادیوں میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اس کے بعد اختر و سلمیٰ دونوں دیر تک روتے رہے اور اِس قدر روئے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اور پھر اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اِس طرح جدا ہوئے کہ پھر جیتے جی نہ مل سکے۔" (72)

حکیم صاحب نے اختر و سلمیٰ کی یہ داستانِ عشق اور میل ملاقاتوں کی رُوداد اِس طرح لکھی ہے جیسے وہ چشم دید گواہ ہوں اور آنکھوں دیکھا حال لکھ رہے ہوں۔ اور اِس ساری داستان سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "سلمیٰ کے حصول میں ناکامی کے بعد (حالانکہ حصول کی بالکل کوشش ہی نہیں کی گئی) اختر نے اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لیے رِندی و مستی اور ہوس ناکی وحُسن پرستی کو آہستہ آہستہ اپنا شیوہ بنا لیا۔۔۔ حالات نے اُنھیں اِس راہ پر ڈال دیا تھا اِس لیے وہ اِس پر چلتے گئے تا آنکہ وہ دل پر سلمیٰ کی محبّت کا داغ لیے اِس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئے۔

اِدھر نیّر صاحب یہ رنگین داستان اور اِس کے المناک انجام کے قصّے بیان کر رہے ہیں اور دُوسری طرف کوکب نے اِس افسانے کو ایک خوب صورت موڑ دے کر "شاعر کے خواب" کی تعبیر بیان کی۔ سلمیٰ کے آخری دو خط ایک اور ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔

سلمیٰ کی شادی کے بعد بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، مگر دونوں اِس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ایک دوسرے کا حصول ممکن نہیں اِس لیے ایک دوسرے کو بھول جانے کے مشورے دے رہے ہیں۔ اِس لیے سلمیٰ ایک خط میں اِس بات کا ذکر کرتی ہیں:

"آپ اب ماضی کی تلخ یاد کو بھول جائیے۔۔ میں آپ کی محبّت کے قابل نہیں رہی۔ اور نہ آپ اس کی بے پایاں اور بے لوث محبّت کے لائق رہے۔" (73)

اِس کے جواب میں کوکب صاحب بھی لکھتے ہیں:

"یقیناً میں تمھاری محبّت کے لائق نہیں رہا۔ بہر حال اِس قصّے کو

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 36 (1,1)

چھوڑ یئے اور چونکہ اب حقیقتاً ہمیں ایک دوسرے کو بھول جانا چاہیے۔اسے بھول جائیے۔بھلا دیجیے۔'' (74)

مگر کوکب صاحب اِس افسانہ محبّت کو اِن خطوط کے ذریعے ایک ''شاعر کا خواب'' کی صورت مرتّب کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں،اِس لیے سلمیٰ سے اپنے تمام خطوط کی واپسی کا مطالبہ بھی کر رہے اور سلمیٰ کی راہ نمائی بھی چاہتے ہیں۔اِس سلسلے میں سلمیٰ لکھتی ہے:

''میں ''ایک شاعر کا خواب'' کے لیے اپنے بعض حالات ایک کہانی کی شکل میں قلم بند کر رہی تھی کیونکہ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ فسانہ لکھنے میں میری راہ نمائی کرو۔'' (75)

اور مذکورہ کتاب میں ''ہلاکِ تلوّن'' (میری غم ناک زندگی کے درد انگیز حالات) ایک افسانہ کی تمہید از سلمیٰ بھی شامل ہے۔اور کوکب صاحب نے بھی اپنی ڈائری کا ایک ورق شامل کیا ہے۔کوکب صاحب ''ایک شاعر کا خواب'' خطوط کی شکل میں مرتّب کرنے کے خواہاں ہیں اور سلمیٰ کو اِس حوالے سے تحفّظات ہیں۔اُسے اپنی رُسوائی کا خوف ہے اِس لیے وہ اپنے خطوط واپس کرنے کا بار بار مطالبہ کر رہی ہے،مگر کوکب صاحب کا اِس سلسلے میں روّیہ اِتنا مثبت نہیں۔وہ اپنا ناول یا افسانہ یعنی اپنی کتاب ''ایک شاعر کا خواب'' خطوط ہی سے مرتّب کرنا چاہتے ہیں۔سلمیٰ کے آخری دو خط،خطوط کی واپسی کا مطالبہ کوکب کے سرد مہر رویّے کے خلاف شدید احتجاج اور اُن کی بے وفائیوں کا تذکرہ ہے۔سلمیٰ لکھتی ہے:

''میں آپ کے تمام مکتوبات واپس کر چکی ہوں،اب آپ کو بھی ایسا کرنا چاہیے تاکہ میں بھی آپ کی طرح اُس طرف سے مطمئن ہو جاؤں۔مطمئن ہو سکوں،مگر آپ سے ایسی اُمید کہاں؟ آپ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ میں کم بخت ہمیشہ پریشانِ خاطر اور محرومِ تسکین ہی رہوں۔معلوم نہیں آپ کو مجھ سے اِتنی عداوت کیوں ہے؟ یا اب ہوگئی ہے۔''

(سلمیٰ نے لفظ ''عداوت'' استعمال کیا ہے جو اِس داستانِ عشق کی بہت سی پرتیں کھول رہا ہے) خط میں آگے لب و لہجہ مزید سخت ہے۔وہ لکھتی ہیں:

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 37 (1,1)

’’یقیناً میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ کی ہر بات جھوٹ، فریب اور دغا تھی۔ آپ نے اپنے خطوط بھی اِس لیے واپس مانگے تھے کہ اس طرح آپ کی غلط بخشیوں یا فریب آرائیوں کے ثبوت میرے پاس نہ رہیں۔ آہ آپ کو مجھ سے ذرا بھی اُنس نہ تھا۔‘‘

(کوکب صاحب تو سلمیٰ کی محبّت اور پھر فراق میں اپنی زندگی تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور سلمیٰ کو اُن کی محبّت ہی کا یقین نہیں ہے) وہ مزید لکھتی ہیں:

’’آپ کے وہ تمام داعیاتِ محبت تصنّع اور بناوٹ پر مبنی نکلے اور مجھے، مجھ عقل کی اندھی، نادان لڑکی کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے ایک پُر مذاق سین اور بس۔ سوچیے اور شرما جائیے۔ آپ نے کس بے دردی کے ساتھ مجھ سے میری زندگی اور زندگی کی تمام حسرتوں کو چھین لیا ہے۔ غارت کر دیا ہے۔ آہ! تباہ کر دیا ہے۔ کس سنگ دلی سے میری امیدوں اور آرزوؤں کو پامال کر دیا ہے۔ مسل دیا ہے۔‘‘ (77)

خط میں صرف کوکب کی سنگ دلی اور اپنی زندگی کی مسرتوں کے چھن جانے اور امیدوں، آرزوؤں کی پامالی ہی کا ذکر نہیں بلکہ کوکب کے کردار و عمل کو بھی واضح کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

’’مجھے رنج ہے، کہہ نہیں سکتی کس درجہ رنج ہے کہ میں اب تک آپ کے سے ظاہر دار، ریا کار، محبت فراموش، بے رحم، مغرور، وفا دشمن، جفا طراز، دل آزار اور ظالم آدمی کو دیوتا کیوں کہتی رہی اور کیوں اِتنی مدت تک اِس طرح نیاز مندی کے ساتھ آپ کی پرستش اپنے لیے جائز اور روا خیال کرتی رہی۔‘‘ (78)

سلمیٰ کے اِس خط کا جواب تو مذکورہ کتاب میں درج نہیں ہے مگر سلمیٰ کے اگلے اور آخری خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوکب صاحب نے کوئی خط لکھا تھا اور سلمیٰ کو عجلت پسند اور ضدّی گردانتے ہوئے ان تمام باتوں کو الزام قرار دے کر اُن کی تردید کی تھی۔ سلمیٰ اپنے خط میں لکھتی ہے:

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 38 (1,1)

''میرے الزامات کا جواب دینے کی آپ میں کیوں ہمت ہو؟ جب کہ وہ الزامات ہیں ہی نہیں۔ جب کوئی بن نہ پڑا تو یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا۔۔۔۔۔۔۔'' میں نے اب اِس پہیلی کو حل کر لیا ہے۔'' مجھ سے آپ کو عداوت نہیں نفرت تھی اور ہے اور یہ محض میری بے وقوفی تھی کہ میں اب تک اِس حقیقت کو نہ جان سکی۔''(79)

یہ کتاب میں سلمیٰ کا آخری خط ہے جس میں اُس نے خود کو فریب خوردہ کہا ہے۔ ایک طرف کوکب صاحب ہیں جو سلمیٰ کی محبّت اور فراق میں زندگی تباہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف سلمیٰ جسے کوکب کی محبّت کا یقین ہی نہیں بلکہ وہ اسے عداوت، نفرت اور فریب قرار دے رہی ہے۔

اختر شیرانی نے کوکب کے فرضی نام سے یہ کتاب ''ایک شاعر کا خواب'' کے نام سے مرتّب کی تھی اور اُسے خطوط کے ذریعے ترتیب دیا تھا۔ سلمیٰ کے خطوط بھی آتے رہے ہوں گے مگر اُنھوں نے اِن خطوط کی روشنی میں ایک خوب صورت افسانہ یا ناول تخلیق کیا اور اُسے خوب صورت موڑ دے کر شاعر کے خوف ناک خواب کی خوف ناک تعبیر پیش کی۔ عبارت کی رنگینی اور جذبات کی بھرپور عکاسی نے اِس افسانے یا ناول کو بہت دل کش بنا دیا اور اِس انداز سے پیش کیا کہ ایک خواب، ایک طرح کی حقیقت معلوم ہونے لگا۔

خادم حسین بٹالوی نے دو اخلاقی جرم کیے۔ پہلے تو اس مسوّدے کو چوری کیا، اور پھر کتاب کا نام بدل دیا۔ ''ایک شاعر کا خواب'' کی بجائے ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کر دیا۔ اِس طرح اُنھوں نے ایک خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کی کوشش کی کہ یہ اختر و سلمیٰ کے اصل خطوط ہیں۔

''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' کے بارے حسنی صاحب کی رائے ہے کہ:

''سلمیٰ کی جانب سے لکھے گئے خطوط کے بارے اچھے خاصے شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

1۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سلمیٰ کا وجود ہی نہیں اِس لیے خطوط بھی افسانہ طرازی سے زیادہ وقعت کے حامل نہیں۔

2۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ سلمیٰ کا وجود تسلیم لیکن اِس قدر ادیبانہ تحریر کسی

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 39 (1,1)

نوجوان اور نومشق خاتون (عمر ابھی 16 سال) کے بس کی بات نہیں۔ اختر نے خود ہی سلمیٰ کی طرف سے خطوط لکھ لیے ہیں۔

3۔ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ یہ خطوط سلمیٰ نے خود ہی لکھے ہیں۔اور ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کے بقول اِس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔" (80)

یہ کون سے لوگ ہیں اور ان میں کون کون افراد شامل ہیں؟ یونس حسنی صاحب نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ اُن کے یہ فرمودات اُنھوں نے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟ البتہ یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہے کہ:

"خطوط کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم مندرجہ بالا کسی گروہ سے کامل اتفاق نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔۔خادم حسین صاحب نے جو مسوّدہ دیکھا تھا وہ اختر کے ہاتھ کا تیار کردہ تھا۔سلمیٰ واختر کے اصل خطوط اس میں موجود نہیں تھے۔بلکہ ان کی نقول یا مرتّب شدہ مواد ہی بٹالوی صاحب کے ہاتھ لگا تھا۔" (81)

یہ خطوط اصل نہیں بلکہ خطوط کی وہ نقل ہے جو اختر شیرانی نے کوکب کے نام سے مرتّب کیے۔وہ انھیں "شاعر کا خواب" کے نام سے ایک افسانے کی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ڈاکٹر یونس حسنی کے بقول:

"جو چیز دُشواری پیدا کرتی ہے وہ اِن خطوط کا اسلوب ہے۔۔۔۔۔۔"اختر وسلمیٰ کے خطوط" میں اسلوب کی یکسانی کو کس طرح نظر انداز کیا جائے؟

سلمیٰ کے خطوط میں بھی اسلوب وطرزِ نگارش کی وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو اختر اور صرف اختر سے مخصوص ہیں اور کوئی ادب شناس نگاہ دونوں کی یکسانی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرے گی اور اِس یکسانیت کے پیشِ نظر اگر کچھ لوگ ان خطوط کو بھی اختر ہی کی نگارشاتِ جمیل قرار دیتے ہیں تو اُن کے اِس شُبہ کو بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔" (82)

مگر پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سُرا صاحب کا کہنا ہے کہ:

"سلمیٰ اور کوکب کے خطوط کے اسلوب میں بھی اور انداز میں بھی فرق

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 40 (1,1)

نظر آتا ہے اِس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلمیٰ و اختر کے خطوط فرضی نہیں ہیں۔" (83)

دونوں قابل احترام شخصیات کا زاویۂ نظر اپنا ہے مگر حقیقت یہ ہی نظر آتی ہے کہ سلمیٰ کے اسلوب پر اختر کا اسلوب حاوی ہوگیا ہے۔ اور ڈاکٹر یونس حسنی کے بقول:

"اختر نے عبارت میں ادبی چاشنی پیدا کرنے، زیبِ داستاں اور افسانے کو رنگین و خوش گوار بنانے اور ادبی آہنگ دینے کے لیے زبان و بیان میں خاصی تبدیلیاں کردی ہیں۔۔۔۔۔۔ اِصلاح اختر کی عادت میں شامل تھی اِس لیے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اختر نے سلمیٰ کی عبارت کی آرائش کے لیے اس میں کافی قلم کاریاں کی ہیں۔" (84)

اب یہ بات تو ڈاکٹر حسنی صاحب نے طے کردی ہے کہ:

"افسانے" کو رنگین بنانے کے لیے اختر نے سلمیٰ کی عبارت کی آرائش کا کام کیا ہے اور اُس کی قلم کاریاں نمایاں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب کوکب نے یہ خطوط مرتّب فرمائے تو ان خطوط میں سلمیٰ کا افسانہ "ہلاکِ تلوّن" (مطبوعہ "کیف"، اجمیر، ستمبر 1928ء، حسنی۔ ص 377) درج کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اور پھر "اپنی ڈائری کے اوراق"، کس مقصد کے لیے دیے ہیں؟ کتاب میں تمام خطوط بھی موجود نہیں ہیں جس سے تسلسل بھی برقرار نہیں رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب (کوکب) کوئی خطوط کی "تدوین" کا کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ تو اِن خطوط کی روشنی میں "رنگین افسانہ" لکھ رہے تھے۔ اور اسے مکمّل کرنے کے لیے جن خطوط کی ضرورت تھی صرف وہ شامل کیے ہیں۔ تمام خطوط شامل کرنا ضروری نہیں تھا۔ کتاب کے آخری دو خط جو سلمیٰ کے ہیں، جن میں اختر پر سنگین الزامات عائد کیے گئے ہیں، اختر نے اُنھیں شامل کیوں کیا ہے؟ یہ شاعر کے خواب کی خوفناک تعبیر ہے جو اختر نے پیش کرکے افسانے کو خوب صورت موڑ دیا ہے، ورنہ ایک آدمی خود ہی کتاب مرتّب کر رہا ہے اور خود ہی اپنے اوپر الزامات لگا رہا ہے، کیوں؟ اگر یہ خط سلمیٰ کے بھی ہیں اور وہ اِس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ "محبت کے نام پر اختر اُسے فریب دیتا رہا ہے" تو اِس کا ذکر کرنا اختر نے ضروری کیوں سمجھا ہے؟ اگر یہ خطوط شامل نہ ہوتے تو کہانی کیا تھی؟ محبّت، جذباتی

D 3/11/2025 5:04 PM PAGE 41 (1,1)

خطوط، راتوں کو تنہائی میں ملاقاتیں، آخر الگ الگ شادی اور اپنا اپنا گھر، قصہ ختم۔
ایسے میں ”شاعر کا خواب“ کدھر جاتا؟ اسے ”شاعر کا خواب“ جیسا اُردو ادب کا شاہکار ”افسانہ“ ہی رہنا چاہیے تھا، جسے خادم حسین بٹالوی صاحب نے ”اختر و سلمیٰ کے خطوط“ کا نام دے کر انتہائی زیادتی کی ہے۔ یہ افسانہ اپنی جگہ بہت مکمّل اور ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، مگر اِس حوالے سے جو احباب نے کہانیاں گھڑی ہیں، وہ دل چسپ بھی ہیں اور فتنہ انگیز بھی۔ اِس بات پر تو سب متفق ہیں کہ اختر کا معاشقہ جنسی آلودگی سے قطعاً مبرّا رہا اور اختر جسمانی قربت کو محبّت اور شباب کے لیے موت خیال کرتے تھے۔ پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ ”سلمیٰ کی شادی اختر کی زندگی کا ایک عظیم سانحہ تھا۔۔۔۔ اختر کی باقی زندگی ماتمِ سلمیٰ بن کر رہ گئی۔“(85)

1926ء میں اختر کی شادی ہوئی۔ 1933ء میں سلمیٰ کی شادی ہوئی، اس کے بعد بہت سی خواتین سے مراسلت رہی۔ 1935ء میں ”رومان“ جاری کیا۔ 1941ء میں سلمیٰ کا شہر چھوڑ کر ٹونک چلے گئے، اور کوئی ایک بھی شہادت نہیں ملتی کہ ٹونک میں اُن پر عاشقی یا دیوانگی کے دورے پڑے ہوں۔

حکیم نیّر واسطی صاحب کہتے ہیں:

”سلمیٰ سے جدا ہونے کے بعد چند برسوں تک جو کچھ ہوتا رہا، زندگی سے خوش گوار انتقام تھا یا زندگی گزارنے کا ایک شاعرانہ طریقہ اور یا پھر حُسن و جمال کی جستجو کا ایک دل فریب مشغلہ اور بس۔“ (86)

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اِس پر تبصرہ فرمایا ہے کہ:

”بے پناہ سگریٹ نوشی اور بغیر پانی یا سوڈا ملائے ہوئے دیسی شراب پینا، خودکشی کا ایک طریقہ ہی تو تھا۔ مر مر کے جینے کا ایک ڈھنگ۔“(87)

کیا یہ سگریٹ اور شراب نوشی اختر نے سلمیٰ سے جدائی کے بعد شروع کی یا اس کے آثار اِس سے پہلے بھی ملتے ہیں؟ خودکشی کے اِس طریقے کو سلمیٰ سے جدائی سے جوڑنا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب مزید لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 42 (1,1)

”سلمیٰ سے جدائی کے بعد اختر کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اُنھیں بُھلا سکیں۔ اُنھوں نے سلمیٰ کو بھلانے کی کوشش میں ہر اُس آستانہ ناز پر جبین نیاز جھکا دی جہاں اُنھیں ذرا بھی گنجائش میسّر آسکی۔ چنانچہ سلمیٰ کے بعد عذرا، اور عذرا کے بعد سندھ کی زلیخا، لکھنؤ کی مہ لقا، امرت سر کی ایک نوبہار ناز، ریحانہ، زہرہ، پروین ثریا، نسرین، ناہید، لالہ رُخ، شمسہ، لیلیٰ اور سب سے آخر میں شیریں اُن کے بُت کدۂ تصوّرات اور اُن کی منظوم داستانوں کی زینت بنی رہیں۔“ (88)

یہ خواتین جو اختر کے بُت کدۂ تصوّر اور منظوم داستانوں کی زینت بنی ہیں، کیا اِس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اختر اِن سب سے عشق فرما کر سلمیٰ کو بھولنے یا اُسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے؟

محمد طفیل صاحب ٹونک تشریف لے گئے اور اختر شیرانی کے مٹکے سے ایسے خطوط جن میں جوانیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں، حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بہ قول اُن کے:

”مقصد یہ تھا کہ اُن لوگوں کو دِکھا سکوں جو یہ کہتے تھے کہ اختر پر کوئی بھی لڑکی نہیں مرتی اور ساری نظمیں فرضی ہیں۔“ (89)

یہ لڑکیوں کے خطوط ہیں اور محمد طفیل صاحب لوگوں کو دکھا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ”لڑکیاں اختر پر مرتی ہیں“ یعنی اِن خطوط میں عشق کا اِظہار لڑکیوں کی جانب سے ہے۔ خطوط حاصل کرنے کے بعد محمد طفیل صاحب اِن خطوط کو یہ کہہ کر ناقابلِ اشاعت قرار دے رہے ہیں کہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے۔ اختر صاحب نے تو ان خواتین کے فرضی نام رکھ کر منظوم داستانیں لکھیں اور اُن کا پردہ رکھا ہے، مگر محمد طفیل صاحب کے ہاتھ جو خطوط لگے اُن میں تو اصلی نام ہوں گے۔ تبھی تو اشاعت پر ہنگامے کا خطرہ ہے۔

اگر خواتین کو اپنے اصل نام لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ یا خطرہ نہیں تھا تو محمد طفیل صاحب کو کیا مجبوری تھی؟ وہ تو خط لائے ہی اِس مقصد کے لیے تھے کہ لوگوں کو دِکھا سکیں۔ محمد طفیل صاحب نے لکھا اور یونس حسنی صاحب نے اس کی تائید کی تو بات درست ہی ہوگی کہ ”لڑکیاں اختر پر مرتی

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 43 (1,1)

تھیں، کیا اختر بھی اُن پر مرتے تھے؟'' اِس بات کا ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو صرف اِتنا کہ ''دوستوں سے تذکرے ہوتے تھے اور خط وکتابت ہوتی تھی۔'' اِس سے کیا نتیجہ اخذ ہوا اختر کی ان گنت عشقیہ داستانوں کا؟

حکیم نیّر واسطی صاحب کا کہنا ہے کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستارانِ اختر میں سے سب کا تعلّق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔'' (90)

اِس کے باوجود یونس حسنی صاحب کا اصرار ہے کہ:

''اختر کے معاملاتِ عشق کو فرضی قرار دینا ہٹ دھرمی ہی ہوسکتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ خواتین کون تھیں اور اب کہاں ہیں؟ تو اِس کا تعلق انسان کے اس ذوقِ تجسس سے ہے جو دوسروں کی کمزوریوں کا پتا چلانے کے لیے روا رکھتا ہے۔ ادبی اعتبار سے ان باتوں کی خاص اہمیت نہیں ہے اس لیے اِس تلاش میں پڑنا لا حاصل ہے۔''(91)

گر یہ دوسروں کی کمزوریوں کا پتا چلانے کا عمل ہے اور اس کی تلاش میں پڑنا بھی لا حاصل ہے تو پھر ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کا یہ عمل کہاں تک درست ہے کہ:

''راقم الحروف (حسنی صاحب) نے طفیل صاحب سے ان ''باقیات الصّالحات میں سے کچھ طلب کیا تھا۔''(92)

یعنی محمد طفیل صاحب ٹونک سے جو خطوط لائے تھے، اُن میں سے کچھ طلب فرما رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد یونس حسنی صاحب نے اختر کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔

''پہلا دور سلمیٰ کے عشق سے پہلے کا زمانہ ہے، دوسرا دور سلمیٰ سے عشق کا زمانہ ہے۔ یہ دور مختصر لیکن حاصل زندگی ہے اور تیسرا دور سلمیٰ کے عشق میں ناکامی کے ردِّ عمل کا نام ہے۔'' (93)

سوال یہ ہے کہ اختر شیرانی کے نزدیک عشق میں کامیابی یا ناکامی کا معیار کیا ہے؟ محبّت کو وہ ایک آسمانی نغمہ کہتے ہیں جو کبھی نفسانی اغراض کے پیکر میں نہیں سماتا۔ یعنی جسمانی قربت کو

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 44 (1,1)

محبّت کی موت خیال کرتے ہیں۔شادی کو محبت اور حُسن کی غارت گری سمجھتے ہیں۔ پھر معیار کیا ہے؟ سلمیٰ سمیت نہ جانے کتنی لڑکیاں اُن پر مرتی ہیں پھر اُن کا عشق ناکام کدھر سے ہے؟ عام تصوّر تو یہی ہے کہ عشق کی کامیابی شادی کی صورت ہی میں ظاہر ہوتی ہے جس کے وہ قائل نہیں اور پھر تو ناکامی ہی ناکامی ہے اور ناکامی کے بعد زندگی میں مر مر کے جینے کا ایک ڈھنگ ہے۔ اِتنے عشق اور ہر ایک میں ناکامی، آہ! بے چارے اختر کی زندگی! اختر صاحب کے اِس المیے کو ڈاکٹر یونس حسنی صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ایک شاعرِ آشفتہ حال کو عشق ہوا۔ یاروں کو سامانِ ارائش گفتار بہم پہنچا۔ اختر کی اِن عشقیہ داستانوں نے اُن کی زندگی کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ ہر شخص نے حسبِ توفیق اِن معاملات میں دلچسپی لی ہے اور ان کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے ۔کسی نے اختر کی زندگی میں سرے سے کسی لڑکی کے وجود سے انکار کیا ہے، کسی نے ان سب امور کو افسانہ طرازی یا تقریبِ شعر گوئی قرار دیا ہے۔ کوئی شہرت پسند اُٹھا ہے تو اُس نے بہ زعمِ دعویٰ محترمی داستان سرائی شروع کر دی ہے اور پھر زیبِ داستان کے لیے کچھ نہ کچھ بڑھا دینا ضروری سمجھا ہے۔ چنانچہ ایک غلط مبحث سا پیدا ہو کر رہ گیا ہے۔'' (94)

یہاں تو ڈاکٹر یونس حسنی صاحب سے ایک بڑا اہم سوال بنتا ہے کہ اگر زیرِ تحقیق موضوع میں کچھ غلط مبحث پیدا ہو جائیں تو محقق کی ذمہ داری کیا ہے؟ اُسے غلط باتوں کو غلط ثابت کر کے، صحیح باتوں کو سامنے لا کر قارئین کی راہ نمائی فرمانی چاہیے کہ نہیں؟ یا صرف اِتنا لکھ کر ''غلط مبحث سا پیدا ہو کر رہ گیا ہے'' اُس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے؟ اور وہ بھی دوسروں کی طرح خاک اُڑا کر اور قارئین کو مزید اُلجھنوں میں ڈال کر اور یہ تلقین کر کے کہ دوسروں کی کمزوریوں کا پتا چلانا بد اخلاقی ہے اور خود ''ڈگری'' لے کر الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے؟ کیا تحقیق اِسی کو کہتے ہیں اور محقق کا یہی منصب ہے؟

اگر اختر شیرانی کے مزاج، خواتین کے حوالے سے اُن کے رویّے اور اُن کے فلسفۂ عشق کو مدِنظر رکھا جائے تو اختر شیرانی کی اس ساری حیاتِ معاشقہ کی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 45 (1,1)

نصر اللہ خاں نے چند جملوں ہی میں اُن کی یہ ساری داستان بیان کر دی ہے۔

مکمل اقتباس پہلے دِیا جاچکا ہے۔وہ دیکھ لیا جائے یا اُن کا لکھا ہوا خاکہ غور سے پڑھ لیا جائے تو ساری بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

یہاں صرف دو جملے ہی دوبارہ لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نصر اللہ خاں صاحب نے لکھا ہے:

''وہ (اختر شیرانی) عشق کرنے کی آرزو میں مرتے رہے لیکن اُن میں روایتی عشق کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یہ فُل ٹائم جاب ہے اور اختر کا مزاج سیمابی تھا۔وہ بلا کے شرمیلے تھے۔'' (95)

حیرت ہے ایک انتہائی شرمیلے اور معصوم شخص کے بارے میں یار لوگوں نے کیا کیا افسانے تراش لیے ہیں، سلمیٰ کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا کہ'' آپ کی راز داں ہستیاں عنقریب کوئی فتنہ برپا کرنے والی ہیں''اور یہ فتنہ برپا ہو کر رہا۔''(96)

سلمیٰ کے بعد دوسرا اہم موضوع جس کا تقریباً تمام خاکہ نگاروں نے ذکر کیا ہے وہ اختر شیرانی کی شراب نوشی ہے۔اختر شیرانی کو شراب کی عادت لاہور میں پڑی۔اِس حوالے سے حکیم نیّر واسطی نے اختر کا اپنا بیان نقل کیا ہے۔اختر کا کہنا ہے کہ:

''میں شعر میں علامہ تاجور کا شاگرد ہوا اور شراب میں حضرتِ جگر کا۔''(97)

ڈاکٹر یونس حسنی اِس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''شراب نوشی کی لت اُنھیں ''حلقۂ اربابِ علم و ادب'' سے وابستگی کے زمانے میں پڑی۔اُردو کا یہ مرکز علامہ تاجور نجیب آبادی نے لاہور میں قائم کیا تھا۔اُردو کے دوسرے مشاہیر کی طرح ''جگر'' بھی یہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔اختر اُس زمانے میں حلقے کے سیکرٹری تھے۔جگر کی صحبت میں اختر شراب کی لذّت سے آشنا ہوئے اور پھر یہ آشنائی تاحیات قائم رہی۔''(98)

ختر شراب پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔شورش کاشمیری نے اُن کی بلانوشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 46 (1,1)

''شراب کے بغیر اُن کا کوئی تصوّر قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ شراب پیتے نہیں تھے، بلکہ حلق کے نیچے غٹا غٹ اُتارتے تھے۔'' (99)

شوکت تھانوی نے تو اختر کی شراب نوشی پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ عالم ہوش میں کبھی نہیں دیکھا۔'' (100)

حکیم نیّر واسطی لکھتے ہیں کہ:

''رفتہ رفتہ اختر شراب میں بہہ گئے تھے۔ جسم میں پانی کی جگہ شراب رہنے لگی تھی۔ شراب کی بدولت گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گیا تھا۔ جگر جل کر کباب ہو گیا۔ شراب نے اُن کی زندگی کے بخیئے اُدھیڑ دیے۔ شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بے کار۔ اور شراب کے بارے وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے۔'' (101)

عاشق بٹالوی صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ:

''وہ (اختر) ایک دن ماڈل ٹاؤن میرے گھر تشریف لائے۔ بوتل اُن کی جیب میں تھی۔ کچھ دیر بیٹھے پیتے رہے لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ اب وہ شراب میں افیم بھی ملاتے تھے۔ میں نے پوچھا ''یہ بدعت کب سے شروع کی؟'' کہنے لگے ''فقط شراب سے نشہ نہیں ہوتا اِس لیے افیم بھی ساتھ ملاتا ہوں۔'' (102)

افیم ملا کر شراب پینے کا ذکر کسی اور مضمون یا خاکے میں نہیں ملتا۔ اس کا ذکر صرف عاشق حسین بٹالوی صاحب نے کیا ہے۔ اِسی طرح کی ایک انوکھی بات کا ذکر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر شیرانی کے دو ہی مشغلے تھے! شاعری اور شراب۔ کہتے ہیں کہ جب احباب کے ساتھ مل کر شراب کی محفل آراستہ کرتا تھا تو پہلے کمرے کے فرش اور دیواروں پر چھڑکاؤ کرتا تھا تا کہ ایک خاص فضا پیدا ہو جائے۔'' (103)

ڈاکٹر صاحب جملے کا آغاز ''کہتے ہیں'' سے کرتے ہیں۔ اِس سے تو خبر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 47 (1,1)

صاحب نے یہ بات کہیں سے سُن رکھی ہے۔اُنھیں نہ تو اس کی مکمل خبر ہے اور نہ اِس پر مکمل یقین۔ چونکہ بات کہنے والے کو خود یقین نہیں اِس لیے یہ بات خود بخود مشکوک ہو جاتی ہے۔

محمد طفیل صاحب نے اختر شیرانی بارے ایک بڑا عمدہ جملہ لکھا ہے کہ:

''اُنھیں شرابی کی حیثیت سے سب جانتے ہیں، دوست کی حیثیت سے کم جانتے ہوں گے۔''(104)

خود محمد طفیل صاحب نے بھی اختر شیرانی کی دوست نوازی کا تو ایک آدھ واقعہ ہی تحریر کیا ہے اور زیادہ اُن کی شراب نوشی اور مدہوشی کے عالم میں غیر انسانی رویّے ہی کو بیان کیا ہے۔محمد طفیل صاحب کو ٹونک میں چند دن اختر صاحب کے ہمراہ بسر کرنے کا موقع ملا تھا۔اُن ایّام کی رُوداد ہی خاکے میں لکھی ہے۔ٹونک میں کلال کے ہاتھوں ''گت'' بننے، مہمانوں کے ساتھ ناروا سلوک، تُو تکار اور ہاتھا پائی کا ذکر زیادہ کیا ہے۔سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہونے والے یومِ اقبال کے ایک جلسے کی کارروائی کا ذکر کیا ہے۔اختر شیرانی کی شراب نوشی اور عالم مدہوشی کے سبب اس جلسے میں بدمزگی پیدا ہوئی۔اختر کے بارے عمومی رائے تو یہ ہے کہ وہ سرِعام شراب نوشی سے پرہیز کرتے تھے اور شراب پینے کے بعد بہکتے تو تھے مگر بھٹکتے نہیں تھے۔ مگر اِس واقعہ میں وہ نہ صرف سرِعام شراب پیتے اور سٹیج پر جا کر بار بار لڑکھڑاتے اور لکنت زدہ زبان سے خدا معلوم کیا بولتے سُنائی دیتے ہیں۔چونکہ منٹو اور قاسمی صاحب اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں اِس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اختر کی شراب نوشی پر اپنے دُکھ اور غم کا اظہار اِس طرح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میں نے جب بھی اختر کو نشے میں دیکھا، یہ سوچ کر اُداس ہو گیا کہ شراب نے ایک نہایت نیک طبع اور پاکیزہ فطرت شاعر کو کتنا بے بس کر ڈالا ہے۔'' مگر مدہوشی کے عالم میں اُن کے مزاج کی نیکی اور پاکیزگی قائم رہتی تھی۔'' (105)

پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب اُن کی شراب نوشی پر اپنے تأسف کا اظہار اِس

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 48 (1,1)

طرح کرتے ہیں:

''شراب نوشی کے سبب عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں سے استمداد تک بھی نوبت پہنچی۔ وہ شخص جس کا احترام مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں جیسے زعمائے قوم بھی ملحوظ رکھتے تھے، دُخترِ رز کے ہاتھوں اِن حالوں کو پہنچ گیا۔'' (106)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب اِس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''اختر صاحب کی مے نوشی حافظ صاحب کے لیے تو سوہانِ روح تھی ہی، باقی خاندان کو بھی اِس کا بڑا قلق تھا۔ بعض بہی خواہ اِس عادت سے نجات کے لیے نسخے اور ٹوٹکے بتاتے رہتے تھے۔ ماسٹر مٹھو لال جی کی تجویز پر اختر صاحب کو شراب سے بچانے کے لیے بھنگ پر لانے کی کوشش کی گئی......۔ مگر اختر صاحب نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر کسی بقراط کی رائے پر شیر کا جھوٹا گوشت بھون کر کھلایا گیا لیکن نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فِش۔'' (107)

اور شراب چھوڑی تو کس وقت جب مرض الموت میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوئے۔ بہ قول ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی:

''حالت سقیم ہوئی تو ڈاکٹروں نے صلاح کر کے کوشش کی اُنھیں دو ایک گھونٹ بطور دوا پلائے جائیں ممکن ہے اِس ترکیب سے ضعف میں کچھ افاقہ ہو! لیکن جب آبِ طرب ناک کا جام مُنہ کے نزدیک لے جایا گیا تو اُس کی بُو کو سونگھتے ہی ہونٹ بھینچ لیے اور مُنہ کی طرف اشارہ کر کے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اُٹھادی۔ مطلب یہ تھا کہ مَے آلود دہن لے کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونا مناسب نہیں۔''(108)

یہ تو اختر صاحب کے اِس دُنیا سے کوچ کر جانے کے وقت کا قصّہ ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں مَے آلود دہن لے کر حاضر ہونا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سے پہلے ٹونک میں ہونے والی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''ٹونک میں گھر سے باہر محفل جمتی تھی۔ اِس محفل میں کوئی شخص بھی پینے پلانے کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ اختر صاحب کلال کے ہاں سے پی آتے اور ایک اڈ ھا

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 49 (1,1)

شیروانی کی جیب میں چھپالاتے۔اسے ڈیوڑھی کے بھاری بھرکم دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں رکھ دیتے۔وقفے وقفے سے اُٹھ کر دروازے کی اوٹ میں جاتے اور گھونٹ لے لیتے۔اگر میں نظر پڑ گیا تو کسی بہانے مجھے گھر کے اندر بھیج دیتے۔ میں سمجھ جاتا اور وہاں سے کھسک لیتا۔اُنھیں اِس بات کا بڑا خیال رہتا تھا کہ میرے بچّوں کو کہیں مجھ سے نفرت نہ ہو جائے۔اس محفل میں دُنیا بھر کے موضوعات پر بحث ہوتی اور اکثر قاری جمیل صاحب سے فرمائش کر کے سورۂ یٰسین کی تلاوت سُنتے۔قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں اور اختر صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔"(109)

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی صاحب نے بھی اختر کے حوالے سے کچھ ایسی ہی باتوں کی تفصیل لکھی ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ:

"اختر پی کر بہکتے ضرور تھے مگر بے قابو نہیں ہوتے تھے۔چھوٹوں کا خیال، بڑوں کا لحاظ، آدابِ محفل کسی چیز میں فرق نہیں آتا تھا۔نشے کی حالت میں بھی اُن کی زبان سے خدا، رسولؐ، مذہب، دینی شعائر کے سلسلے میں کوئی گستاخانہ جملہ سُننے میں نہیں آیا۔"(110)

حکیم سید محمود احمد برکاتی نے اختر کی شراب نوشی کے حوالے سے دو واقعات بیان کیے ہیں۔ایک تو مدرسے کے ایک طالب علم، مولوی صاحب کا قصّہ ہے، جو اُن کی شراب کی بوتل چُرا کر بھاگے اور سیدھے مسجد میں جا گھُسے۔اختر صاحب اُن کے پیچھے گئے مگر مسجد کی پہلی سیڑھی سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔بہ قول حکیم صاحب:

"اختر فوراً ہی مسجد کی پہلی سیڑھی سے نیچے اُتر آئے اور خاص تیور کے ساتھ کرارے لہجے میں کہا:

"مولوی صاحب نیچے آجاؤ شرم کرو شرم۔اِس ناپاک بوتل کو لے کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ مجھے دیکھو اللہ کے فضل سے ایک سیڑھی آگے نہیں بڑھا۔اللہ مجھے معاف کرے۔"اور پھر کہنے لگے"مولوی صاحب بوتل نالی میں پھینک دو۔اب یہ میرے کام کی نہیں رہی۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 50 (1,1)

میں گندہ آدمی ہوں، میرے مقدر میں گندگی لکھی ہے۔ یہ بوتل تمھارے طفیل مسجد میں ہو آئی ہے۔ اب میرے کام کی نہیں۔ یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف بڑھے اور اُن کے ہاتھ سے بوتل لے کر پوری طاقت سے دیوار پر دے ماری۔" (111)

دوسرا واقعہ حکیم صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"ایک بار اُن کی مشہور نعت جو آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ، بالخصوص ہر اتوار کی صبح نشر ہوتی تھی

ے
سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

اور یہ نعت چچا (حکیم ظہیر احمد برکاتی) کو بہت پسند تھی۔ ایک بار اُنھوں نے اختر سے یہ نعت سنانے کی فرمائش کی۔ اختر صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

"ظہیر میاں! آپ کہیں تو کوئی نظم سنا دوں، اِس وقت میں نعت نہیں سنا سکتا۔ میں پھر آؤں گا اور یہ نعت ضرور سناؤں گا مگر اِس وقت نہیں۔"

یعنی نعت کے لیے جس قدر طہارتِ جسم و ذہن کی ضرورت اور حضورِ قلب کی جو کیفیت اس کے لیے ان کی نظر میں مطلوب تھی اُس وقت وہ اس سے محروم تھے۔" (112)

حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ:

"اُن کا ایمان بڑا قوی تھا اور اُن کے دل میں شراب کی حرمت کا وہی عقیدہ اور مسجد کے تقدّس کا وہی جذبہ تھا جو ایک مسلمان کے جذبے میں ہوتا ہے۔" (113)

اِن واقعات سے اختر کی شراب بارے ذاتی رائے اور دینی شعائر اور آپؐ سے عقیدت، محبّت اور احترام کا پتا چلتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کا کہنا ہے کہ "اِس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اختر صاحب عشقِ رسولِ اکرمؐ سے سرشار تھے اور دل کی گہرائیوں سے نعت کہتے تھے۔"

شورش کاشمیری مرحوم نے اختر کے عشقِ رسولؐ کا ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا ہے جو عرب ہوٹل میں پیش آیا اور جس میں اختر نے مدہوش ہونے کے باوجود ایک گستاخ نوجوان کی

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 51 (1,1)

سرزنش کی اور:

''پھر بے اختیار رونے لگے۔ کہتے جاتے تھے، ہم عاصیوں کا تو ایک ہی ٹھکانہ ہے سرکارِمدینہ، دربارِمدینہ۔''(114)

ڈاکٹر صاحب نے اِس واقعہ کی زیادہ تفصیل نہیں لکھی۔ ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر مذہب کے بڑے پاس دار تھے۔ ٹونک کا ماحول اور اُن کا گھرانہ، کٹر مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اسی رنگ میں اختر کی شخصیت کا اِرتقا ہوا۔ یہی نظریات اُن کے خمیر میں داخل ہو گئے تھے۔ اُن کی شاعری کی ابتداء نعت سے ہوئی اور آخر میں بھی عمدہ نعتیں کہیں۔ عشقِ رسولؐ اُن کی زندگی کے آخری ایام میں اُن پر کافی حاوی رہا۔ اِس سلسلے میں ایک رِقّت آمیز واقعہ شورش صاحب نے بیان کیا ہے۔

''ایک بار چند کیمونسٹ نوجوانوں نے اُنھیں گھر رکھا تھا۔ مختلف ادیبوں اور شاعروں کے بارے اُن کی رائے طلب کر رہے تھے۔ جن کے بارے پوچھا جا رہا تھا وہ سب عموماً ترقی پسند حلقہ کے شاعر تھے۔ شراب کا دَور چل رہا تھا، اختر نشے سے سرشار تھے۔ یوں بھی وہ افادی شاعری کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ سب ہی کی نفی کر گئے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ ترقی پسند تحریک ہی کے منکر ہیں تو افلاطون اور ارسطو پر سوال کر بیٹھے۔ اختر نے دونوں کو اپنے حلقۂ سخن میں زیرِتربیت قرار دے دیا۔ شراب کی ترنگ میں جو تھے ایک جوشیلے قسم کے نوجوان نے تڑ سے سوال کیا،'' آپ کا حضرت محمدؐ کے بارے کیا خیال ہے؟'' اختر ایک دم تڑپ اُٹھے اور بلور کا گلاس اُٹھا کر نوجوان کے سر پر دے مارا۔'' بدبخت ایک عاصی سے سوال کرتا ہے۔ ایک سیاہ رُو سے پوچھتا ہے۔ ایک فاسق سے کیا کہلوانا چاہتا ہے؟'' تمام جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ روتے روتے گھگی بندھ گئی، کہنے لگے'' تم نے اِس حالت میں یہ نام کیوں لیا؟ تمھیں جراَت کیسے ہوئی؟ گستاخ، بے ادب''۔ اس لڑکے کو مجلس سے نکال دیا اور پھر خود بھی اُٹھ کر چلے گئے۔ اُس روز رات بھر روتے رہے۔ کہتے تھے'' یہ لوگ اِتنے نڈر ہو گئے ہیں کہ ہمارا آخری سرمایہ ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں گناہ گار

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 52 (1,1)

ضرور ہوں لیکن یہ مجھے کافر بنانا چاہتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ‘‘(115)

یہ واقعات اختر شیرانی کے عشقِ رسولؐ کی داستان سناتے ہیں۔اختر شیرانی شراب پیتے تھے مگر اِس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔جو لوگ شراب نہیں پیتے تھے اختر اُن کو اِس خبیث شے سے بچنے اور دُور رہنے کی تلقین کرتے۔حزیں کاشمیری بیان کرتے ہیں کہ:

’’ایک ملاقات میں شراب کی بوتل کا ڈھکن اُن سے کھل نہیں رہا تھا تو ’’میں‘‘ نے اُن کے ہاتھ سے بوتل لے کر دانتوں میں ڈھکنا جکڑ کر آنِ واحد میں بوتل سے الگ کر دیا۔اب بوتل ہاتھ میں لے کر قہر آلود نظروں سے مجھے (حزیں کاشمیری کی طرف) دیکھ رہے ہیں، کہنے لگے:’’یہ تم نے کیا کیا؟ ایک بوتل میرے ہاتھ سے چھین لی پھر اسے دانتوں سے کھول دیا۔اِس خبیث شے کو شرفاء ہاتھ تک نہیں لگاتے۔مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسی بوتل کو چھوؤ گے بھی نہیں۔‘‘ مرحوم جس انداز میں تلقین کر رہے تھے اُس میں سچائی اور نیت کا خلوص شامل تھا۔‘‘ (116)

میرزا ادیب لکھتے ہیں:

’’گو وہ بلا نوش تھے مگر شاگردوں کے سامنے شراب کا ذکر تک نہیں کرتے تھے۔اِس معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔‘‘(117)

حکیم نیّر واسطی کہتے ہیں:

’’شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ لوگوں کے سوا کسی کو آتا دیکھتے تو شراب کی بوتل اِدھر اُدھر چُھپانے کی کوشش کرتے۔‘‘(118)

ڈاکٹر یونس حسنی کا بیان ہے کہ:

’’مروّت اور پاس داری کا یہ عالم تھا کہ شغل مے کے وقت ہر اُس شخص سے دُور رہتے جس کے متعلق اُنھیں خیال ہوتا کہ اس پر اُن کا یہ شغل گراں گزرے گا۔ اگر سرِ راہ مڈبھیڑ ہو جاتی اور شراب کے نشے میں ہوں تو کترا کے نکل جاتے۔‘‘ (119)

نصر اللہ خاں اپنے خاکے ’’اختر شیرانی‘‘ میں اُن کی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 53 (1,1)

''شراب نہیں پیتے تھے تو بجھے بجھے سے رہتے ، جیسے کوئی پھول کملا گیا ہو۔ایسی حالت میں ان سے مل کر ہول آتا۔وہ کھل کر بات نہ کر پاتے اور نہ ہی اُن کی بات کا مزا آتا اور جب شراب پیتے اور سرور گھٹتا تو اپنے خول سے نکل آتے اور یہ دوسرے ہی اختر ہوتے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے دوست سے اختر کا تعارف کروایا۔اختر خوب پیئے ہوئے تھے۔اُن کی بھولی بھالی باتیں سن کر اور اُن کی بچّوں جیسی شرارتیں دیکھ کر میرے دوست نے کہا:

'یار اگر شراب پی کر انسان ایسا ہی معصوم ہو جاتا ہے تو شراب ضرور پینی چاہیے۔''(120)

ایک رِندِ لا اُبالی ہوتے ہوئے بھی اختر اخلاقی ، دینی اور سماجی اقدار کے پابند دِکھائی دیتے ہیں۔اُن کے ہر عمل میں اسلامی شعائر اور مشرقی روایات کے احترام کی جھلک نظر آتی ہے اور بقول ڈاکٹر یونس حسنی:

''اختر رومان پسند آدمی تھے۔لا اُبالی، لاپرواہ اور بے نیاز۔ایسے لوگ عموماً کسی اخلاقی پابندی یا سماجی رسم و رواج کے کسی بندھن کو برداشت نہیں کرتے لیکن اختر کی زندگی اس رُجحان کی نفی کرتی ہے۔''(121)

اختر شیرانی لا اُبالی ہونے کے باوجود ایک معصوم انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے اختر شیرانی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے حوالے سے ایک بڑی بات کی جانب اشارہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''بچپن میں وہ چھ سات برس کا عرصہ جو حافظ صاحب اپنے بیٹے اختر سے دُور رہے (1906ء-1913ء)، اختر کی سیرت کی تشکیل میں فیصلہ کُن کردار کا حامل تھا۔اِس اہم ترین مرحلے میں اختر کا باپ کی محبّت سے محروم رہنا اُن کے مزاج کے اکثر نمایاں مظاہر کا ذمہ دار ہے۔بچپن کا وہ احساسِ محرومی تا حیات اختر کی شخصیت پر سایہ فگن رہا۔اِس وجہ سے اُن میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی اور قوتِ اِرادی کمزور رہ گئی۔نتیجہ یہ کہ وہ اپنے والد کے حسبِ منشا رسمی تعلیمی مدارج طے نہ کر سکے۔اُن کی مے نوشی کی عادت کو بھی اِسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور والد کے عتاب کے باوجود اُن کی

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 54 (1,1)

پرستش کی حد تک احترام کو بھی۔" (122)

اختر صاحب اپنے والد کی ناراضی کے باوجود اُن کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ اُنھیں اِس بات کا اعتراف تھا کہ "بابا" کی برہمی بلا وجہ نہیں اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ جو کچھ بنانا چاہتے تھے وہ اختر نہ بن سکے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے بہ قول:

"حافظ صاحب کو بیٹے کے تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔ اِس تکدّر کا اِظہار اُس وقت ہوا جب اختر کی پہلی قابلِ ذکر نظم "جوگن" انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی مجلّے "اُردو" (اورنگ آباد) میں شائع ہوئی (شمارہ جنوری، 1925ء) اور مولوی عبدالحق مرحوم نے حافظ صاحب کو مبارک باد کا خط لکھا۔ خط پڑھ کر بڑے جھلّائے اور بظاہر اپنی اہلیہ مگر درحقیقت اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا "ہونہہ"! ــــسرا شاعری کرنے چلا ہے۔" (123)

اپنی تمام بے راہ رویوں اور حافظ صاحب کے سخت گیر رویّے کے باوجود، اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ حکیم نیّر واسطی کا کہنا ہے کہ:

"والد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اپنے والد کا نام بڑے احترام سے لیتے اور اکثر اُن کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر کرتے۔" (124)

میرزا ادیب نے بھی اِسی قسم کی رائے کا اِظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'اختر اپنے والد کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔ والد کے ناروا سلوک کے حوالے سے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے بلکہ خود کو قصوروار سمجھتے تھے کہ اُن کی اُمیدوں پر پورا نہ اُتر سکے۔ کہا کرتے تھے:

"قصور میرا ہے، اُن کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ جو کچھ بنانا چاہتے تھے، میں بن نہ سکا۔" (125)

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 55 (1,1)

''حافظ صاحب اُن سے خفا تھے مگر اختر نے ہمیشہ اُن کا ذکر احترام سے کیا۔ اختر صاحب اس واقعہ کا ذکر بطورِ خاص کرتے ''زندگی میں صرف ایک بار باوا نے ہمیں مُنہ لگایا تھا اور ''تنقید شعر العجم'' کا مسودہ دے کر فرمایا: ''اِس پر ایک نظر ڈال لو۔ میں نے دیکھا تو جہاں جہاں لہجہ سخت ہو گیا، پینسل سے وہاں نرم کر دیا۔''(126)

یہ اختر کا علمی مقام و مرتبہ تھا کہ حافظ صاحب بھی اپنے مسودّے پر اُن کی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''شیرانی خاندان میں اخلاقی پابندیاں پہاڑوں کی چٹانوں سے زیادہ سنگین تھیں اور اختر اس خاندان کا باغی بچّہ تھا اور اس بغاوت کی سزا وہ اپنے سخت گیر باپ سے عمر بھر پاتا رہا۔ حافظ صاحب ثقہ بزرگ تھے اور صاحبزادے رِند۔ لہٰذا دونوں باپ بیٹے میں بنتی نہیں تھی لیکن اِس کے باوجود، میں نے اختر کو مولانا کا جتنا ادب کرتے دیکھا ہے شاید ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کا اِتنا ادب کرتا ہو۔ مولانا اختر کی شراب نوشی اور اُس کی محبّت اور بے باک شاعری کی وجہ سے اُس سے خفا رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اختر کو علیحدہ کر دیا تھا۔''(127)

وراختر جو اپنے باپ سے صحیح معنوں میں پیار حاصل نہ کرسکا، ساری عمر اُس پیار کے لیے ترستا رہا۔ گھر سے بے دخلی کی تصویر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے یوں بیان کی ہے:

''حافظ صاحب کو جب اُن کی مے نوشی کی خبر ہوئی تو گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ سزا کے طور پر اختر صاحب کا گھر میں داخلہ ممنوع فرمایا۔ اختر صاحب کو اِس تازہ صورتِ حال کا علم نہ تھا۔ وہ حسبِ معمول آدھی رات کو گھر پہنچے۔ دستک کی آواز سن کر والدہ نے دروازہ کھولے بغیر، بیٹے کو باپ کا حکم پہنچایا۔ یہ سن کر اختر دروازے کے آگے بنی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے اور ماں اپنی اکلوتی اولاد کی محبت کے باعث بند دروازے کے اندر کی طرف بیٹھ کر اُنھیں مَے خواری سے اِجتناب کی تلقین کرتی رہیں۔ والدہ کی نصیحتوں کا یہ سلسلہ اذانِ فجر کے قریب، حافظ صاحب کی بیداری سے پہلے ختم ہوا۔ اختر صاحب کو والد کی سخت گیری کا اندازہ تھا، اِس لیے اُسی دن اپنے رہنے کا کسی اور جگہ انتظام کر لیا۔''(128)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 56 (1,1)

اِس واقعہ کو ڈاکٹر یونس حسنی نے یوں بیان کیا ہے:

''شراب چُھپنے والی تو تھی نہیں ۔حافظ محمود شیرانی کو بھی بالآخر ایک دن اس کا علم ہوگیا۔ وہ اُن کی عاشق مزاجی، لاپرواہی اور گھریلو ذمہ داریوں کی طرف سے بے اعتنائی کی وجہ سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اب تو گویا اُنھیں اختر سے نفرت سی ہوگئی! یہ شراب کے نشے میں عموماً رات گئے گھر پہنچتے اور وہاں محمود صاحب کے حکم سے پہلے ہی دروازہ بند کر دیا جاتا۔ یہ جاتے اور بند دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ ماں قدموں کی آواز سُن کر دروازے کی دوسری جانب آ کر بیٹھ جاتیں، سمجھاتیں، نصیحتیں کرتیں اور دونوں ماں بیٹے باتوں میں رات کاٹ دیتے۔''(129)

حکیم نیّر واسطی بیان کرتے ہیں:

''اختر کا معمول یہ تھا کہ وہ اکثر رات گئے گھر لوٹتے تھے، اور اسی اثناء میں بارہا ایسا ہوا کہ اُن کے والدِ محترم نے غصّہ میں آ کر مکان کے اندر سے زینے کو قفل لگا دیا۔ اختر آتے اور اس دروازہ کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی مامتا کے زیرِ اثر اُن کی والدہ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آ کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر باتیں کرتے رہتے اور اِس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تھی، تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کُھلتا۔''(130)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اِس واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ واقعہ محترم پروفیسر سیّد محمد یونس حسنی صاحب نے اختر پر اپنے مقالے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے حوالے سے درج کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب جو صرف اختر سے اپنی محبت نیز اپنے شاعرانہ مزاج کے باعث اِس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے ضروری احتیاط ملحوظ نہ رکھ سکے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس یک شبی واقعہ کو فعل ماضی مطلق کی بجائے ماضی استمراری میں بیان کیا، نیز لفظ ''عموماً'' کے اضافے سے اسے دوام عطا کر دیا۔ پھر آگے چل کر۔۔۔۔۔۔۔

خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 57 (1,1)

کے مصداق بعض خلاصہ نویسوں نے اس واقعہ میں شوہر کی اطاعت اور بیٹے کی محبّت کے مثالی پہلو نظر انداز کر کے اس میں پائی جانے والی ڈرامائی کیفیت کو اپنے مضمون چمکانے کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح اختر کے سلسلے میں حکیم نیّر واسطی مرحوم کے بعض اور بیانات بھی ناقدروں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنے۔" (131)

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے بڑے دبے لفظوں اور احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے حکیم نیّر واسطی صاحب کے بیانات کی تردید کرتے ہوئے صرف یہ لکھا ہے کہ اُنھوں نے "ضروری احتیاط نہیں کی"۔ حقیقت یہی ہے کہ حکیم صاحب نے بہت سے واقعات اس ضروری احتیاط کے بغیر لکھے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش بہرصورت موجود ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا واقعہ کے علاوہ، سلمیٰ کا پہلا گمنام خط ملنے کے بعد اختر کی حالتِ زار، سلمیٰ کی شادی کی رات اختر کی کیفیت اور پھر اختر کے جنازے کو روک کر برقعہ پوش خاتون کا، اختر کا آخری دیدار وغیرہ۔ محققین کو حکیم صاحب کے بیان کردہ واقعات سے اختلاف ہے۔

گھر سے بے دخلی کے بعد کے واقعات کا بھی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اختر ٹوہ لگائے رکھتے کہ بابا کب لاہور سے باہر جاتے ہیں، بس وہ لاہور سے نکلے اور انھیں گھر آنے کی چھٹی ملی۔ ہم بہن بھائیوں کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ اور "بابا" واپس آتے تو ہم کھلونے چھپا دیتے اور اُن کے کالج جانے پر ہی نکالتے۔ ہمیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر "بابا" ان کے بارے میں پوچھیں تو بھاء جی (اختر صاحب) کا نام نہ لینا۔"(132)

حافظ صاحب کی سخت گیری اور اختر صاحب کا احترام اور اُن سے عقیدت و محبّت کا قصّہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ 1940ء میں جب حافظ صاحب ملازمت سے سبک دوش ہو کر ٹونک جانے لگے تو اختر صاحب بہت گھبرائے۔ حافظ صاحب اُنھیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے اور اختر صاحب اُن کے بغیر لاہور میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ حالانکہ لاہور سے اُنھیں بڑی محبت تھی۔ لاہور

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 58 (1,1)

نے اُنھیں شہرتِ دوام بخشی تھی۔ اُن کا حلقۂ یاراں یہاں تھا۔ لاہور اُن کی تمام دلچسپیوں کا مرکز تھا اور پھر یہاں سلمیٰ بھی رہتی تھی مگر اختر صاحب اِن تمام چیزوں کو چھوڑ کر ''بابا'' کے ہمراہ جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے بہ قول:

''بابا'' کے قریبی دوستوں سے سفارش کروائی، بابا بہ مشکل اِس پر آمادہ ہوئے کہ ''وہ'' (اختر) چلا چلے لیکن میری نظروں کے سامنے نہ آئے۔''

باپ بیٹے نے یہ معاہدہ مرتے دم تک نبھایا۔ نہ باپ نے کبھی طلب کیا اور نہ بیٹے نے جرأت کی۔ ہاں بعض اوقات حافظ صاحب کوئی علمی مسئلہ چھان بین کے لیے کاغذ کے پُرزے پر لکھ کر نیچے بھجوا دیتے تو اختر صاحب اپنا سب کام چھوڑ کر اُس پر توجّہ دیتے اور مطلوبہ معلومات مہیّا کر کے اوپر بھجواتے۔'' (133)

اختر صاحب تمام تعزیرات سہتے رہے مگر نہ تو احترام میں کمی آنے دی اور نہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر آیا۔ ایک چپ چاپ اور خاموش محبّت اور عقیدت کا رشتہ قائم رہا اور اسے زندگی بھر نبھاتے رہے۔ اِس سلسلے میں اختر کی محبّت کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب:

''ٹونک میں حافظ صاحب کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو اس رندِ خرابات نے جنازہ روک کر، پٹی پکڑ کر کچھ اس انداز میں صدائے نالہ وشیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اِس منظر کو دیکھ کر زار وقطار رو رہا تھا۔'' (134)

نصر اللہ خاں کا بیان ہے کہ:

''میں اجمیر پہنچا اور اختر سے ملا تو وہ مجھے گلے لگا کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا اور کہنے لگا ''نصر اللہ! میرے ابّا مر گئے۔'' حالانکہ اختر کے ابّا کو مرے یہ دوسرا سال تھا۔'' (135)

والد کے احترام، عقیدت اور محبّت کے ساتھ ساتھ والدہ کا احترام بھی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہوش وحواس سے عاری ہونے کی حالت

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 59 (1,1)

میں بھی اُنھوں نے والدہ کے احترام کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ یہی رویّہ اُن کا اپنی دوسری والدہ کے ساتھ تھا۔ ان دونوں کے آگے تو بالکل بچّہ بن جاتے تھے۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد عِدّت پوری ہونے پر ہماری دوسری دادی امّاں عزیزوں سے ملنے، ہمارے آبائی گاؤں شیرانی آباد گئیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک ماہ رہنے کا خیال تھا۔ جاتے ہوئے ان سے (اختر) سے کہہ بیٹھیں ''میں تمھاری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ناراض ہو کر جا رہی ہوں، اب واپس نہیں آؤں گی۔'' اُس وقت تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن ابھی اُن کو گئے دو ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ بے قرار ہو گئے۔ مجھے (ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی) ایک عزیز کے ہمراہ اُن کو لینے بھیجا۔ جب وہ واپس آئیں تب اُنھیں چین آیا۔'' (136)

اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ اختر اپنی حقیقی اور سوتیلی والدہ کا احترام کرتے تھے تو اختر کی سوتیلی ماں بھی اُن سے بے پناہ محبّت کرتی تھیں۔ نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''مولانا محمود شیرانی کی دوسری بیوی بھی اختر کو اپنی بھرپور محبّت دینا چاہتی تھیں لیکن مولانا پرانے ڈھنگ کے آدمی تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ اس پیار سے کہیں وہ اور نہ بگڑ جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قابل آدمی اور اچھا آدمی اچھا باپ بھی ہو۔''(137)

اختر صاحب کو اپنی اولاد سے بھی بے پناہ محبّت تھی، گھر میں بچّوں سے ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ اُن کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ مظہر محمود کو اُن کے شوق کے پیشِ نظر ہوائی بندوق خرید کر دی۔ بیٹی نسرین اختر کے شوہر نظر الدین خاں شیرانی دریائے بناس میں ڈوب کر وفات پا گئے جبکہ شادی کو ابھی چالیس روز ہی ہوئے تھے، بہت غمگین ہوئے۔ اس سانحہ پر قطعۂ تاریخ کہا: ؎

ہے غرقِ ظلمت و یاس آسماں آج
مہِ روشن ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے
اجل ڈوبا نظر الدیں جواں آج

1366 ہجری (138)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 60 (1,1)

پہلا بیٹا جاوید محمود زبور اختر جسے وہ بے حد عزیز رکھتے تھے مرگیا اور اُس سے کچھ مُدّت بعد عزیز ترین دوست ''شیون'' مرحوم کی خودکشی کا حادثہ پیش آیا جو اُن کے لیے سوہانِ روح تھا۔ان حادثات کا ذکر اُنھوں نے یوں کیا ہے:

بعد از غمِ جدائی عذرا مرے لیے
یادِ زبور و ماتمِ ''شیون'' ہے آج

یہ بات بھی درست ہے کہ وہ میدانِ عمل کے آدمی نہ تھے۔اپنی لااُبالی طبیعت کے سبب گھریلو ذمہ داریوں کی جانب توجہ نہیں کرتے تھے۔گو حافظ صاحب اور اُن کی والدہ یہ ذمہ داری احسن انداز سے نبھارہے تھے مگر اختر کو اِس بات کا احساس ضرور تھا کہ وہ اپنے فرائض سے غافل ہیں۔حافظ صاحب کی رحلت کے بعد اختر صاحب نے اپنی قوتِ اِرادی کو مجتمع کیا اور پروگرام بنایا کہ وہ ٹونک سے لاہور جائیں گے اور مکان کا بندوبست کر کے اہلِ خانہ کو وہاں بلوالیں گے۔ فسادات کے دِنوں میں 1948ء کے آغاز میں جوں توں کر کے لاہور پہنچے اور حکیم نیّر واسطی صاحب کے ہاں قیام کیا۔اُن دِنوں کا حال حکیم نیّر واسطی صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

> ''آپ اپنے اہل وعیال کو بہت زیادہ یاد کرتے تھے۔ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ ''حکیم صاحب! میں نے اپنی بیوی کا کوئی حق ادا نہیں کیا اور پھر اِس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔اور ایک دن آپ نے بچوں کا ذکر چھیڑ دیا اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے وقت اپنے صاحب زادے خوشنود (مظہر محمود) کی نقلیں اُتارنے لگے اور پھر فرمانے لگے ''ہائے میں نے بچوں کے لیے بھی کچھ نہیں کیا اور اس کے بعد اس قدر روئے کہ دیر تک روتے چلے گئے۔اُسی زمانے میں اُن کی ایک صاحبزادی کا خط آیا جس میں اُنھوں نے لکھا کہ 'والدہ کہتی ہیں، تم تو پردیس میں جا کر آرام سے بیٹھے ہو اور ہم یہاں تکلیف میں پڑے ہوئے ہیں'' تو اس پر آپ نے ایک سانیٹ لکھا جس میں آپ نے اپنی رفیقۂ حیات سے یوں خطاب کیا:
>
> تجھ سے کہہ دوں تو ترے دل پہ ملال آتا ہے
> آبگینے کی نزاکت کا خیال آتا ہے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 61 (1,1)

اور پھر ایک مرتبہ آپ کی رفیقۂ حیات نے لکھا کہ تم ہمیں لاہور جا کر بھول گئے تو اس پر آپ نے
''پیمانِ وفا'' کے عنوان سے ایک سانیٹ لکھا: ؎

بربِّ کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تم کو
ہر ایک ذرّہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تم کو
(139)

اختر صاحب نے بیوی بچّوں کے لیے کچھ کیا یا نہیں مگر اُن کے دل میں اُن کے لیے جو محبّت اور احساس ہے اس کی خبر ضرور ہوتی ہے۔ اور سیّد منظور الحسن برکاتی صاحب کا اختر کی شخصیت کے بارے یہ تبصرہ بالکل درست ہے کہ:

''وہ ایک ایسا شخص تھا جو دُنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔'' (140)

دردمندی، وسیع القلبی اور کشادہ دستی اختر صاحب کی فطرت کا حصّہ تھی۔ نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

''اختر سر تا پا پیار تھے، خلوص تھے، اُن کا بچپن، اُن کی جوانی پر بھی مسلّط رہا۔ وہی بھول پن، وہی بچّوں ایسی معصوم معصوم شوخیاں، وہی ضد۔'' (141)

سعادت حسن منٹو کی رائے بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''بعض اوقات اختر بالکل بچے بن جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو اور حرکات بالکل بچّوں کی سی ہوتیں۔ بچّہ بن کر وہ بچگانہ قسم ہی مسرّت محسوس کرتے تھے۔''
منٹو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اختر کے پاس دولت نہیں۔ قلّاش تھے مگر بڑے رحم دل اور انسانیت دوست تھے۔'' (142)

اختر سے اپنی پہلی ملاقات کے بعد احمد ندیم قاسمی اپنے تأثر کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:

''اُن کی شخصیت بھی سیدھی سادھی تھی، اُن کی گفتگو میں بھی محبّت کی چاشنی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنا مقبول شاعر، اتنا نرم گفتار بھی ہو سکتا ہے۔'' (143)

احمد ندیم قاسمی نے اپنی بے روزگاری کے دِنوں کا ذکر کرتے ہوئے، اختر کے احساس اور بڑے پن کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اُن دِنوں احمد ندیم قاسمی اپنے بھائی کے ساتھ لاہور میں ایک کرائے کے مکان میں مقیم تھے۔ ایک دن اُن کی غیر موجودگی میں اختر اُن کے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 62 (1,1)

کمرے کے تالے میں وہ کاغذ لٹکا آئے جس میں لکھا تھا:

”میں نے سنا ہے تم بے کار ہو اور تمھیں کوئی ذریعۂ معاش نہیں مل سکا۔ میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔ اِس لیے تمھیں ”حکم“ دیتا ہوں کہ جب تک تمھارے روزگار کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا، تم میرے خرچ پر صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، بعد دوپہر کی چائے اور رات کا کھانا، عرب ہوٹل میں کھاؤ گے۔“(144)

اور احمد ندیم قاسمی، مسلسل تین ماہ اُن کے حکم کی تعمیل میں عرب ہوٹل سے کھانا کھاتے رہے۔ اِسی احساس، انسان دوستی، ہمدردی، سیر چشمی اور دوسروں کے کام آنے کے جذبے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے احمد ندیم قاسمی اُنھیں ”فرشتہ سیرت انسان“ کہتے ہیں۔

میرزا ادیب، اختر شیرانی کے بارے لکھتے ہیں:

”زندگی کی اعلیٰ قدروں سے وابستگی ناقابلِ شکست تھی۔ بڑے شاعر ہی نہیں، بڑے انسان بھی تھے۔“(145)

اِس بڑے انسان کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے اُن کی شخصیت کے پرت کھولے ہیں۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”اُن کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی اور یہ کشش عبارت تھی، علم و فن، آداب و اخلاق، شرم و حیا، خلوص و وفا، مودّت اور سب سے بڑھ کر دوسروں سے ہمدردی کرنے اور اُن کے چھوٹے چھوٹے غم بانٹ لینے سے۔“(146)

اختر صاحب کسی کو دُکھ یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ کسی سائل کا سوال ردّ نہیں کر سکتے تھے بلکہ از خود بھی ضرورت مندوں کی امداد پر آمادہ رہتے تھے۔کسی رسالے یا ریڈیو اسٹیشن سے روپیہ آتا تو گھر تک آتے آتے راستے ہی میں پیسے ختم ہو جاتے۔سب کے سب مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ پہنی ہوئی قمیض اور پاؤں کے سلیپر تک ضرورت مندوں کو دے دیتے۔ اِن باتوں کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب اختر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 63 (1,1)

''اختر صاحب ریڈیو اسٹیشن سے تانگے میں بیٹھ کر موہنی روڈ اپنے کسی دوست کے پاس جارہے تھے۔ راستے میں کسی وجہ سے تانگے والے کا چالان ہوگیا۔ موہنی روڈ پہنچ کر دروازے پر دستک دے کر اختر صاحب نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور تانگے والے کی طرف بڑھایا اور بولے ''تانگے والے! مجھے افسوس ہے کہ تمھارا چالان ہوگیا۔ یہ پیسے تم رکھ لو۔'' اُن دِنوں سو روپیہ بڑی رقم تھی، اور تانگے کا کرایہ صرف چار آنے۔ لہٰذا تانگے والا گھبرا گیا۔ اِس اثنا میں وہ دوست گھر سے نکلا۔ اُس نے یہ صورت دیکھی تو جیب سے دس روپے نکال کر تانگے والے کو دینا چاہے، لیکن اختر صاحب نہ مانے اور تانگے والے کو اُن سے سو روپے لیتے ہی بنی۔'' (147)

مال و منالِ دُنیا سے اِس بے نیازی کو حکیم نیّر واسطی بھی بیان کرتے ہیں:

'ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹونک اُن کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب ڈاک خانے سے پیسے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں کو بانٹتے آئے اور جب وہ گھر پہنچے تو صرف پانچ روپے کا ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں تھا۔'' (148)

گو اُنھیں خود تو روپے پیسے سے کبھی رغبت نہ رہی مگر دوسروں کی ضرورتوں کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا۔ محمد طفیل، اُن کی انسان دوستی کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''نازش صاحب کہتے ہیں کہ ایک دن اختر صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کے فلاں دوست کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ دو تین ماہ سے بے کار ہے۔ نوبت فاقوں تک آن پہنچی ہے تو یہ بڑے پریشان ہوئے۔ دو تین دن تک دوڑتے بھاگتے رہے۔ کہیں سے تین سو روپوں کا انتظام کیا۔ مجھے ڈھونڈا، ساتھ لے کر دوست کے مکان کی طرف چلے۔ مکان آیا تو خود نیچے ٹھہر گئے۔ مجھے کہا ''اوپر جا کر روپے دے آؤ۔'' میں نے کہا ''اختر صاحب! اپنے ہاتھ سے دیجیے۔'' کہنے لگے ''خود روپے دیتے ہوئے شرم آئے گی۔''

ایسے ہی اوصاف اور کردار کے پیشِ نظر محمد طفیل کہتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 64 (1,1)

''سوائے شراب کی عِلّت کے میں نے اختر صاحب میں کوئی خرابی نہ دیکھی۔ وہ اپنے ملنے والوں کی عزت کرتے تھے۔ اُن کی مدد کرتے تھے، اُن سے پیار کرتے تھے۔ غرض معصوم سے انسان تھے جو اختر شیرانی کے نام سے معروف ہیں۔'' (149)

شراب نوشی اور احباب نوازی کے سلسلہ میں اُنھیں جن مالی پریشانیوں کا سامنا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ وہ ہر طریقے سے روپیہ کمانے یا حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے لیکن اس کے برخلاف ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کے بقول:

''اختر کے کردار میں استغناء، ایمان داری اور حلال و حرام کے پختہ شعور کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اُنھوں نے روپیہ حاصل کرنے کے لیے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ضمیر کے خلاف ہوتا۔'' (150)

اختر صاحب صرف شعر و نغمہ کی صدا تھے۔ روپیہ پیسہ اُن کی ترجیح میں شامل ہی نہیں تھا۔ حکیم نیّر واسطی کہتے ہیں:

''اُنھوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کھولا، کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ اُنھوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کیے لیکن وہ کبھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکے کیوں کہ آمد و خرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہوا۔'' (151)

روپے کا حساب کتاب رکھنا اُن کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ تو صرف خرچ کرنا جانتے تھے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کو اکثر یہ خیال آتا ہے کہ:

''اختر صاحب اپنی محدود اور بے قاعدہ آمدنی کے باوجود ایسی کشادہ دلی، فراخ دستی کا مظاہرہ کیسے کر لیتے تھے؟ اُن کی زندگی کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ بیش و کم کا نہیں بلکہ اندازِ چشمِ کرم کا تھا۔'' (152)

یہ چشمِ کرم ہی کا فیض تھا کہ ہاتھ کھلا اور دل محبّت سے لبریز تھا۔ رقیق القلب اِس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر مُرجھائی ہوئی کلیاں پڑی نظر آئیں، وہیں بیٹھ کر دیر تک اُنھیں دیکھتے اور روتے رہے اور کہتے رہے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 65 (1,1)

ے مجھے تو کچھ اِنھی بیمار کلیوں سے محبّت ہے

اختر رقیق القلب انسان تھے اور عمر کے آخری حصّے میں تو رِقّتِ قلب میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بقول حکیم نیّر واسطی:

’’جب وہ سیر کرتے کبھی کبھی راوی روڈ کی طرف نکل جاتے اور وہاں ایک کیمپ میں مہاجرات کی زبوں حالی کا نقشہ دیکھتے تو کھڑے کھڑے رونے لگتے۔‘‘ (153)

اُس زمانے میں بڑے افسردہ رہتے تھے۔ اُن کی سانیٹ ’’مہاجرہ‘‘ اُنھی دِنوں کی یاد گار ہے۔ ایک دن شورش کاشمیری سے کہنے لگے:

’’شورش! انسان پاگل ہو گیا ہے۔ جمنا میں صدیوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ اب کے دیکھا اور محسوس کیا جیسے اس کی آنکھ کا پانی بہہ گیا ہے۔ ستلج پر نظر ڈالی، بیوہ کے سہاگ کی طرح ویران تھا۔ بیاس دیکھا، دونوں کناروں پر بے آس لوگوں کے ڈیرے اُداس پڑے ہیں۔ پانچ دریاؤں کا پانی خون ہو گیا ہے شورش!‘‘ (154)

اُس عہد میں بات بات پر روتے تھے، آنسو بے اختیار آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ اپنی اس حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

ے روتا ہے بات بات پہ یوں بار بار کیوں
اختر خبر نہیں، دلِ ویراں کو کیا ہوا

یہ ویرانی تو ہر حسّاس دل کا مقدّر ہے اور اختر شیرانی تو کچھ زیادہ ہی حسّاس تھے۔

حکیم سیّد محمود احمد برکاتی صاحب نے چند سطور میں اختر شیرانی کی مکمل شخصیت کو بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’اُن کا دامن شراب نوشی کے سوا، ہر نوع کی آلودگی سے پاک تھا۔ وہ اخلاق و سیرت کے محاسن کے حامل تھے۔ مشرقیت اور قدامت اُن کی ادا ادا سے جھلکتی تھی۔‘‘ (155)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 66 (1,1)

اور بقول حکیم نیّر واسطی:

”وہ اِتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں اُن میں جمع ہوگئی تھیں۔ وہ نہایت کریم النفس، نیک محضر، خلیق اور دوست نواز تھے۔ عطا پاش اور خطا پوش، وہ ایک مردِ قلندر اور فقیرِ خاک نشیں تھے۔ اور اُن کے دل میں مہر و یاری کے سوا کسی کے لیے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہیں تھی۔ سیر چشمی اور مال و منالِ دُنیا سے بے نیازی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اختر بے حد ہمدرد بنی نوعِ انسان تھے۔ جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا، تلملا اُٹھے اور اکثر رو پڑتے اور عورت ذات کی مصیبت تو کبھی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اخلاق، انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بہت بڑے انسان تھے۔ دوستوں کے معاملے میں بے حد فیاض، سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے۔“(156)

اِس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھا اور دیکھا جائے تو وہ کون سی انسانی خوبی ہے جو اختر میں نہیں۔ اختر شیرانی کی شخصیت کا مکمل عکس، سیّد منظور الحسن برکاتی کے اِس بلیغ تبصرے میں موجود ہے:

”وہ ایسا شخص تھا جو دُنیا میں صرف چاہنے اور چاہے جانے کے لیے آیا تھا۔“(157)

گو کچھ لوگوں نے اُن کی شراب نوشی اور عشق کے شعروں کو ضرورت سے زیادہ ہوا دے دی ہے وگرنہ اختر شیرانی کی زندگی، کلیوں اور پھولوں کی کہانی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 67 (1,1)

حواشی

1۔ اختر شیرانی نقوش، لاہور (آپ بیتی نمبر، جون 1964ء ص۔ 1428

2۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، کہاں سے لاؤں اُنھیں، لاہور، القا پبلی کیشنز، 2011ء ص۔ 1

اختر شیرانی 4 مئی، 1905ء کو محلہ مہندی باغ (ٹونک میں پیدا ہوئے۔ دادا نے اپنے ایک متوفی بیٹے (محمد داؤد خاں، 18۔ جولائی، 1895ء، یکم اکتوبر، 1900ء، ٹونک) کے نام پر محمد داؤد خاں نام رکھا۔ علاوہ ازیں نو مختلف تاریخی نام نکالے گئے جن سے ظاہری و معنوی اعتبار سے سنہ 1323 ہجری برآمد ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک نام مسعود خسرو ایسا ہے جو آگے چل کر اختر نے اپنے بعض مضامین میں استعمال کیا۔ (ص۔ 1)

3۔ اختر شیرانی پٹھانوں کے مشہور قبیلے شیرانی سے تعلق رکھتے تھے۔ سرحدی پٹھانوں کا یہ قبیلہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے متصل جنوبی وزیرستان میں آباد ہے اور اپنے جدِّ اعلیٰ ملک قیس عبدالرشید کے پڑپوتے ''شیرانی'' کے نام سے منسوب ہے۔ اِس قبیلے کے بعض خاندان راجپوتانے میں آباد ہو گئے تھے۔ اختر کے اسلاف ریاست جودھ پور مارواڑ میں آباد ہوئے تھے۔ جہاں ''شیرانیوں کی ڈھانی'' کے نام سے شیرانی پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی بستی آباد ہے۔ اختر کے بزرگوں کو سید احمد شہیدؒ سے ارادت تھی اور وہ اُن کے مرید تھے۔ چنانچہ سید صاحبؒ کے دوسرے رفقاء کی طرح انھیں بھی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اختر کے پردادا حاجی چاند خاں وزیرالدولہ کے عہد (1834۔ 1865ء) میں جودھ پور سے ٹونک آئے اور ''قافلے'' میں قیام کیا۔

مظہر محمود شیرانی مرتّب ''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی'' جلد اوّل، لاہور، مجلسِ اُردو ادب، 1966ء

سید صاحبؒ کے قافلے کے مجاہدین ٹونک کے جس محلّے میں اقامت گزین ہوئے وہ ''قافلہ'' کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء، ص۔ 28

4۔ چاند خاں کے لڑکوں میں سب سے بڑے اسماعیل خاں اُس دور کی مروّجہ تعلیم (جس میں بنیادی حیثیت فارسی زبان کو حاصل تھی) پا کر سرکار ٹونک میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے خوب معزز ہو گئے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء، ص۔

28

جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 68 (1,1)

''محمد اسماعیل خاں ٹونک کے منشی خانے میں نائب میر منشی مقرر ہوئے۔ نواب محمد علی خاں نے اُنھیں اپنی بیگم (مشرف بیگم) کا کامدار مقرر کر دیا۔ اس طرح محمد اسماعیل خاں کا خاندان ٹونک کا معزز خاندان شمار کیا جاتا تھا۔
جاوید اختر بھٹی، ''20 معروف ادبی شخصیات'' لاہور، برائٹ بکس، 2006ء، ص۔ 316

5۔ حافظ محمود شیرانی کا پہلا نام محمد میکائیل تھا۔ اسماعیل خاں کی ایک بیاض کے حوالے سے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں ''بتاریخ 29 شوال، 1297 ہجری بمطابق کنوار سری یکم 1937 بکرمی، یوم سہ شنبہ، 5۔ اکتوبر، 1880ء، بعد مغرب یعنی غروبِ آفتاب برخوردار محمد میکائیل (عرف محمد محمود) تولد شد بمقام ٹونک

اسمِ تاریخی نظام الدین اسمٰعیل، منظور میاں، حمید الدین خاں (معنوی)
اِس عبارت کے نیچے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے نوٹ لکھا ہے ''عرف محمد محمود اصل عبارت سے اوپر بعد میں لکھا گیا ہے۔ غالباً اُس وقت جب بھائی مودود خاں تولد ہوا اور ناموں میں تبدیلی عمل میں آئی۔
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء، ص۔ 30

6۔ یہ واقعہ پبلک احتجاج 1921ء ٹونک کی ریاستی دور کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ٹونک میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوا۔ یہ ایک پبلک احتجاج تھا جو ''مادھے والی کا جھگڑا'' یا ''ہنگامہ 1921ء کے نام سے مشہور ہوا۔ رعایا کی جانب سے حقوق طلبی کے اِس مظاہرے کو سختی سے کچل دیا گیا۔ پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ خصوصیت سے زیرِ عتاب آئے۔ حافظ صاحب کی گرفتاری کے بھی احکام جاری ہو گئے۔ بعض حضرات وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ حافظ صاحب کی گرفتاری کے احکام اُن کے بھائی مسعود خاں کی شکایت پر جاری ہوئے تھے۔ کسی بہی خواہ نے وارنٹ پہنچنے سے پہلے اُنھیں (حافظ صاحب کو) صورتِ حال کی اطلاع دے دی۔ یہ اپنے ملازم کو ساتھ لے کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور مارواڑ چلے آئے اور قیام جاری رکھا۔ اسی عرصۂ قیام میں حافظ صاحب کا قبیلے کی ایک خاتون سے دوسرا نکاح ہوا۔ یہ واقعات 1921ء سے تعلق رکھتے ہیں۔
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء، ص۔ 56

حافظ صاحب کے دوسرے نکاح کی داستان بھی ڈاکٹر صاحب نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
''حافظ صاحب کے بھائی مقصود خاں مزاج کے تیز تھے۔ اپنی پہلی بیگم کو (جن سے کوئی اولاد نہ تھی) جواب دے دیا۔ وہ ڈھانی اپنے میکے چلی گئیں۔ اِس بات کا قبیلے والوں نے بہت بُرا مانا اور جب حافظ صاحب وہاں پہنچے تو اُن کو آڑے ہاتھوں لیا۔ قبیلے کی پنچایت کے فیصلے کے مطابق (جرگے کا کردار قبائلی زندگی میں ہمیشہ فیصلہ کُن رہا ہے) حافظ صاحب

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 69 (1,1)

نے یہ نکاح کیا۔ان دوسری بیگم سے اُن کے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ایضاً ص۔150

ڈاکٹر صاحب اِس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

”حافظ صاحب کے پہلی بیگم (والدہ اختر شیرانی) سے تعلقات زیادہ خوش گوار نہ تھے۔وہ بڑی سیدھی، باوقار، بردبار اور ہمدرد خاتون تھیں۔تاہم میاں بیوی کے درمیان ان بن رہی۔اس کا آغاز اُس وقت ہوا جب حافظ صاحب کے قیام انگلستان کے زمانے میں اُن کے مخالف اعزہ نے یہ مشہور کر دیا کہ اُنھوں نے وہاں شادی کر رکھی ہے۔وہ بدخواہوں کے اِس پروپیگنڈے کا شکار ہوگئیں اور حافظ صاحب نے بھی واپسی پر اِس لغو الزام کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اختلافِ رائے اُس وقت سامنے آیا جب اختر صاحب ذرا بڑے ہوئے اور ماں کو اُن کی شادی کا اشتیاق ہوا۔اُن کی مرضی تھی کہ اپنی نند زہرہ (اہلیہ نیاز محمد خاں شیرانی وکیل دربار ٹونک، حافظ صاحب کی یہ بہن دوسری والدہ سے تھیں اور اُن سے صرف دو ماہ چھوٹی تھیں اور اُن سے دلی محبّت کرتے تھے) کی لڑکی سے بیٹے کا رِشتہ کریں۔اختر صاحب بھی راضی تھے مگر اِس بات پر حافظ صاحب کو آمادہ کرنا پتھر میں جونک لگانے کے مترادف تھا۔غرض یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ 28۔مارچ 1928ء میں اکلوتی بچی کے انتقال کے بعد اختر صاحب واحد اولاد تھے۔جب اُنھوں نے مَے نوشی شروع کی تو پہلے والدہ کو پتہ چلا۔اُنھوں نے بیٹے کی محبّت اور شوہر کے خوف سے اِس بات کو ایک عرصے تک پوشیدہ رکھا۔باپ کو اُس وقت پتہ لگا جب یہ عادت پختہ ہو چکی تھی۔تعلقات میں کشیدگی کا بڑا سبب یہی معاملہ تھا۔چنانچہ آخر آخر میں بول چال کا موقع بھی کم ہی آتا تھا۔ویسے حافظ صاحب ان کا پورا خیال رکھتے تھے اور وہ بھی شوہر کا بڑا احترام کرتی تھیں۔غرض 1946ء میں شوہر کا انتقال ہوا۔

1948ء میں جوان بیٹے (اختر) کا داغ لگا تاہم اُن کا عالم تسلیم و رضا دیدنی تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں بیگموں کی آپس میں ایسی الفت تھی کہ انجان دیکھے تو سمجھے حقیقی بہنیں ہیں۔1957ء میں دونوں ساتھ ساتھ حج پر گئیں۔جہاں بڑی بیگم چند روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد 8۔ذی الحجہ، 1376ھ (6۔جولائی 1957ء) کو منیٰ کے مقام پر جاں بحق تسلیم ہوئیں۔

ایضاً ص۔164

چھوٹی بیگم (خدیجہ بیگم) کا 6۔اکتوبر، 1984ء کو شیخوپورہ میں انتقال ہوا۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اُن کی تاریخ بھی کہی۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 70 (1,1)

کاست ''قلبِ ماہ'' چوں ہاتف بگفت

الف=ا

برخدیجہ رحمتِ موفور باد

گفت مظہر سالِ تاریخِ وفات

باخدیجہ طاہرہ محشور باد

1406 - 1 = 1405ھ

مشمولہ ''مجموعہ گلہائے تاریخ''، مرتّب فخر بخاری، لاہور، اظہار سنز، 2019ء، 1441ھ، ص۔ 42

''اختر صاحب اپنی دوسری والدہ (بیگم حافظ محمود شیرانی) کو ''بی چی'' کہتے تھے۔ یہ پہلے اختر کے حقیقی چچا مقصود خاں شیرانی کی اہلیہ تھیں یعنی اختر صاحب کی چچی تھیں۔ چچی بی کا مخفف ''بی چی'' ہے، اختر صاحب آخر تک اُنھیں اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔''

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، سہ ماہی ''سورج''، مدیر تسلیم احمد تصوّر، لاہور، سالنامہ، اکتوبر تا دسمبر، 2006ء، جلد 35، شمارہ 2، ص 110

7۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں: ''جب ٹونک سے جلاوطن ہو کر حافظ صاحب مارواڑ میں مقیم تھے، اُس وقت اختر کی عمر 16 برس ہو چکی تھی۔ اب'' حافظ صاحب نے سوچا کہ اُنھیں (اختر) لاہور لے جا کر اورینٹل کالج میں داخل کرا دیں۔ اِس مقصد سے بیٹے کو لے کر ستمبر/اکتوبر 1921ء میں لاہور پہنچے۔''

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، ص۔ 56

8۔ اختر شیرانی، خود نوشت خاکہ، مشمولہ ''نقوش'' آپ بیتی نمبر، 1964ء، لاہور، ص۔ 1428

9۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''شعلۂ مستعجل''، مشمولہ ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، لاہور، القا پبلی کیشنز، 2011ء، ص۔ 2

10۔ اختر شیرانی، خود نوشت، نقوش آپ بیتی نمبر، ص۔ 1429

11۔ جاوید اختر بھٹی، ''20 معروف ادبی شخصیات''، لاہور، برائٹ بکس، 2006ء، ص۔ 32

12۔ اختر شیرانی نے تو ''رومان'' کے بارے صرف یہی لکھا ہے کہ ''بوجوہ بند ہو گیا'' مگر ''رومان کے اجراء اور بندش کی کہانی عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور حکیم نیّر واسطی نے تفصیل سے بیان کی ہے۔

13۔ عاشق حسین بٹالوی، ''چند یادیں چند تاثرات''، لاہور، آئینۂ ادب، 1969ء، ص۔ 135

14۔ ایضاً، ص۔ 137

15۔ عاشق حسین بٹالوی، ’’چند یادیں چند تاثرات‘‘، لاہور، آئینہ ادب، 1969ء، ص۔139

16۔ ماہِ نو، جنوری، 1949ء، ص۔25

16-A۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، سہ ماہی ’’سورج‘‘ سال نامہ، اکتوبر تا دسمبر 2006ء، جلد 35 شمارہ 2، لاہور، ص۔160

17۔ حکیم نیر واسطی، ’’اختر شیرانی‘‘، مشمولہ ’’نقوش‘‘، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر 1956ء، ص۔889

18۔ ایضاً، ص۔889

19۔ نقوش مکاتیب نمبر، دوم، ص۔737، یہ خط 11۔اکتوبر، 1946ء کو لکھا گیا

20۔ اختر شیرانی ’’خودنوشت‘‘، ص۔1429

21۔ جاوید اختر بھٹی، ’’20 معروف ادبی شخصیات‘‘، لاہور، برائٹ بکس، 2006ء، ص۔317

22۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ’’وے صورتیں الٰہی‘‘، لاہور، قوم کتب خانہ، 1976ء، ص۔39

23۔ حکیم نیّر واسطی، ’’سلمیٰ و اختر‘‘، لاہور، کتاب خانہ نورس، 1950ء، ص۔128

24۔ شورش کاشمیری، ’’قلمی چہرے‘‘، کراچی، مجلسِ یادگارِ شورش، 1999ء، ص۔37

25۔ ایضاً، ص۔37

26۔ حکیم نیّر واسطی، نقوش، لاہور، شخصیات نمبر 2، اکتوبر 1956ء، ص۔897

27۔ محمد طفیل، ’’جناب‘‘، لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، 1961ء، ص۔59

28۔ حکیم نیّر واسطی، نقوش، لاہور، شخصیات نمبر 2، اکتوبر 1956ء، ص۔898

29۔ نصر اللہ خاں، ’’کیا قافلہ جاتا ہے‘‘ کراچی، مکتبہ تہذیب و فن، 1984ء، ص90، 91

30۔ محمد طفیل، ’’جناب‘‘، ص۔59

31۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ’’اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب‘‘، کراچی، انجمن ترقی اُردو، 1976ء، ص۔72

32۔ حکیم نیّر واسطی، ’’نقوش، شخصیات نمبر 2‘‘، ص۔889

33۔ سعادت حسن منٹو، ’’گنجے فرشتے‘‘، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2009ء، ص۔51

34۔ حکیم سیّد محمود احمد برکاتی، ’’جادۂ نسیاں‘‘، لاہور، کتاب سرائے، 2009ء، ص۔51

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 72 (1,1)

35۔ ایضاً ،ص۔52

36۔ عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں چند تاثرات''،لاہور،آئینۂ ادب،1969ء، ص۔131

37۔ ایضاً،ص۔133

38۔ خادم حسین بٹالوی،''اختر و سلمیٰ کے خطوط''،لاہور،آئینۂ ادب،1957ء،ص۔8 , 9

39۔ ایضاً،ص۔12

40۔ ایضاً،ص۔12

41۔ ایضاً،ص۔12

42۔ اختر شیرانی کا بیان مشمولہ''چند یادیں چند تاثرات''،ص۔131

43۔ عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں چند تاثرات''،ص۔133

44۔ خادم حسین بٹالوی،''اختر و سلمیٰ کے خطوط''،لاہور،آئینۂ ادب،1957ء،ص۔17 , 18

45۔ خادم حسین بٹالوی،''اختر و سلمیٰ کے خطوط''،لاہور،آئینۂ ادب،1957ء،ص۔20

46۔ ایضاً،ص۔21

47۔ ایضاً،ص۔24

48۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ،''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء،ص۔60

49۔ حکیم نیّر واسطی،''سلمیٰ و اختر''،لاہور، کتاب خانہ نورس، 1950ء، ص۔70

50۔ ایضاً،ص۔21،22

51۔ عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں چند تاثرات''ص۔134

52۔ حکیم نیّر واسطی،''سلمیٰ و اختر''،ص۔26

53۔ خادم حسین بٹالوی،''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ،ص۔31

54۔ ایضاً،ص۔29

54-A۔ ایضاً،ص۔34

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 73 (1,1)

55۔ خادم حسین بٹالوی، ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔36

56۔ ایضاً ص۔55 , 56

57۔ ایضاً ص۔69 , 70

58۔ ایضاً ص۔75 , 76

59۔ ایضاً ص۔77

60۔ حکیم نیر واسطی، ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر 1956ء، ص۔897

61۔ مکتوب مظہر محمود خاں شیرانی ابن اختر شیرانی بنام یونس حسنی، مؤرخہ 22۔اکتوبر، 1962ء، بحوالہ ڈاکٹر یونس حسنی، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، 1976ء، ص۔45

62۔ خادم حسین بٹالوی، ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔197 , 198

63۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی، ''اُردو ادب ماحولیاتی تناظر''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2022ء، ص۔75

64۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔45

65۔ خادم حسین بٹالوی، ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔80

66۔ خادم حسین بٹالوی، ''اختر و سلمیٰ کے خطوط''، لاہور، آئینہ ادب، 1957ء، ص۔88

67۔ ایضاً ص۔115

68۔ ایضاً ص۔135

69۔ ایضاً ص۔163, 164

70۔ حکیم نیرّ واسطی، ''سلمیٰ و اختر''، ص۔84

71۔ ایضاً ص۔87

72۔ ایضاً ص۔99, 100

73۔ خادم حسین بٹالوی، ''اختر و سلمیٰ کے خطوط'' ص۔164

74۔ ایضاً ص۔194

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 74 (1,1)

75۔ ایضاً،ص۔176

76۔ ایضاً،ص۔202

77۔ ایضاً،ص۔202

78۔ ایضاً،ص۔203

79۔ ایضاً،ص۔208

80۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔379

81۔ ایضاً،ص۔379

82۔ ایضاً،ص۔384

83۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سرا،خط بنام راقم،17۔اگست،2022ء

84۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔385

85۔ ایضاً،ص۔46

86۔ حکیم نیّر واسطی،''سلمیٰ واختر''،ص۔130

87۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔47

88۔ ایضاً،ص۔47

89۔ محمد طفیل،''جناب''،لاہور،اِدارہ فروغِ اُردو،1961ء، ص۔58
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا کہنا ہے کہ محمد طفیل خاص مشن پر ٹونک گئے تھے۔مقصد کچھ مخصوص پردہ نشینوں کے خطوط حاصل کرنا تھا جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ (ڈاکٹر صاحب کی راقم اور پروفیسر فخر بخاری سے گفتگو،15۔نومبر،2017ء)

90۔ حکیم نیّر واسطی،''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش''،لاہور،شخصیات نمبر،اکتوبر1956ء، ص۔897

91۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔53

92۔ ایضاً،ص۔52

93۔ ایضاً،ص۔53

94۔ ایضاً،ص۔50

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 75 (1,1)

95۔ نصراللہ خاں،''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔90

96۔ خادم حسین بٹالوی،''اختر وسلمٰی کے خطوط''،ص۔164

97۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم،ص۔892

98۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔53

99۔ شورش کاشمیری،''قلمی چہرے''،ص۔37

100۔ شوکت تھانوی،''شیش محل، لاہور، اُردو بک سٹال،1944ء،ص۔34

101۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ''اختر شیرانی''،مشمولہ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم،ص۔893

102۔ عاشق حسین بٹالوی،''چند یادیں چند تاثرات''،ص۔146

103۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید،''وے صورتیں الٰہی''، لاہور، قومی کتب خانہ،1976ء،ص۔36

104۔ محمد طفیل،''جناب''،ص۔63

105۔ احمد ندیم قاسمی،''میرے ہم قدم''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،2007ء،ص۔18

106۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''شعلۂ مستعجل''،مشمولہ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، لاہور، القا پبلی کیشنز2011ء،ص۔20

107۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،ص۔18

108۔ ایضاً،ص۔19

109۔ ایضاً،ص۔7

110۔ حکیم سیّد محمود احمد برکاتی،''جادۂ نسیاں''، لاہور، کتاب سرائے،2009ء،ص۔50

111۔ ایضاً،ص۔42

112۔ ایضاً،ص۔43

113۔ ایضاً،ص۔43

114۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی،''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔14،13

115۔ ڈاکٹر یونس حسنی،''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔74،73

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 76 (1,1)

116۔ حزیں کاشمیری، ''کہاں گئے وہ لوگ''، لاہور، اِدارہ کتاب گھر، 2005ء، ص۔166

117۔ میرزا ادیب، ''ناخن کا قرض''، لاہور، امتزاج پبلی کیشنز، ص۔39

118۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم، ص۔893

119۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔75

120۔ نصر اللہ خاں، ''کیا قافلہ جاتا ہے''، ص۔90

121۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔73

122۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، ص۔2

123۔ ایضاً، ص۔2

124۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم، ص۔892

125۔ میرزا ادیب، ''ناخن کا قرض''، ص۔32

126۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی، ''جادۂ نسیاں''، ص۔45

127۔ نصر اللہ خاں، ''کیا قافلہ جاتا ہے''، ص۔92

128۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، ص۔3

129۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔57

130۔ حکیم نیّر واسطی، ''اختر و سلمیٰ''، ص۔75

131۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، ص۔3

132۔ ایضاً، ص۔4

133۔ ایضاً، ص۔4

134۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ ''اختر شیرانی''، مشمولہ ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم، ص۔892

135۔ نصر اللہ خاں، ''کیا قافلہ جاتا ہے''، ص۔195

136۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، ص۔15

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 77 (1,1)

137۔ نصراللہ خاں، ''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔96

138۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''مجموعہ گلہائے تاریخ''، مرتب سید فخر حسین بخاری، لاہور، اظہار سنز،2019ء،ص۔22

139۔ حکیم نیّر واسطی، ''اختر و سلمیٰ''،ص۔165,164

140۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔17

141۔ نصراللہ خاں، ''کیا قافلہ جاتا ہے''،ص۔90

142۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،2009ء،ص۔52,51

143۔ احمد ندیم قاسمی، ''میرے ہم قدم''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،2007ء،ص۔12

144۔ ایضاً،ص۔15

145۔ میرزا ادیب، ''ناخن کا قرض''، لاہور، امتزاج پبلی کیشنز،1981ء،ص۔32

146۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔7

147۔ ایضاً،ص۔9

148۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ 'اختر شیرانی'، مشمولہ ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم،ص۔889,888

149۔ محمد طفیل، ''جناب''،ص۔63

150۔ ڈاکٹر یونس حسنی، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔74

151۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ 'اختر شیرانی'، مشمولہ ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم،ص۔891

152۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔10

153۔ حکیم نیّر واسطی، ''سلمیٰ و اختر''،ص۔162

154۔ ڈاکٹر یونس حسنی ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ص۔75، بحوالہ شورش کاشمیری، روزنامہ ''کوہستان''، لاہور،8 ستمبر1963ء

155۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی، ''جادۂ نسیاں''،ص۔52

156۔ حکیم نیّر واسطی، خاکہ 'اختر شیرانی'، مشمولہ ''نقوش شخصیات نمبر''، جلد دوم،ص۔889,888

157۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''،ص۔17

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 78 (1,1)

’’میراجی‘‘ غلیظ پیکر، لطیف روح

(1912ء - 1949ء)

پیدائش: لاہور (25 مئی، 1912 وفات: بمبئی، 3 نومبر 1949ء)

میراجی کی شخصیت کے کئی رنگ اور رُوپ ہیں اور جس دانش ور نے بھی اُس کی شخصیت پر قلم اُٹھایا ہے، اُس نے اُس عکس کو بیان کیا ہے جو اُس کے مشاہدے میں آیا ہے۔

الطاف گوہر اُسے ایک ’’درویش‘‘ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ

’’کوئی درویش تھا جو بال بڑھائے، ہاتھوں میں گولے اور گلے میں مالا سجائے، سچ کی تلاش میں اس نگری میں آ نکلا اور جب اُس نے دیکھا کہ یہاں تو جھوٹ ہر لمحہ جوان رہتا ہے تو وہ جہاں سے آیا تھا، وہیں پلٹ گیا لیکن اِس مختصر سے عرصے میں اُس کی ذات ہر ملنے والے کی زندگی پر اپنا عکس چھوڑ گئی۔‘‘(1)

الطاف گوہر کو میراجی جھوٹ نگری میں سچ کے متلاشی نظر آتے ہیں تو قدرت اللہ شہاب اُن کے فلسفۂ حیات کو ایک ’’اُلجھن‘‘ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

’ ’میراجی کا نام لیتے ہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان پُراسرار گولوں کا ذکر کیا جائے جو وہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا عادی تھا، یا اُس کے لباس، اُس کے بالوں، اُس کی آنکھوں، اُس کے معاشقوں اور اُس کی دیگر اضطراری حرکات کا ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے وہ زندگی کے ساتھ ایک ترچھے زاویے پر وابستہ تھا۔‘‘(2)

اُن گولوں، لباس، اضطراری حرکات، معاشقے اور زندگی کے ساتھ ترچھے رویّے کا ذکر تقریباً ہر خاکہ نگار نے کیا ہے مگر ہر ایک کی سوچ اور اُس کے اِظہار کا انداز اور زاویہ اپنا ہے۔ سب سے پہلے تو میراجی کا بعنوان ’’کچھ اپنے بارے میں‘‘ خودنوشت خاکہ ہے۔ اِس خودنوشت خاکے (تحریر) میں میراجی نے نہ صرف اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کیا ہے بلکہ بچپن کے حالات نے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 79 (1,1)

اُن کی زندگی پر جو اثرات مرتب کیے اُن کا ذکر بھی کیا ہے اور شاعری پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے شروع ہی میں وضاحت کر دی ہے کہ میری نظموں کا نمایاں پہلو ''جنسی حیثیت'' ہے۔ اُن کی شاعری میں جنسی پہلو دبی ہوئی خواہشات کا اظہار ہے۔ اسی نُقطہٗ نظر سے اُنھوں نے گزرے ہوئے واقعات کو دیکھا ہے۔ زمانۂ طفلی میں اُنھیں والد کی ملازمت کے سلسلے میں گجرات کاٹھیاواڑ، بلوچستان، سندھ میں سکھر، جیکب آباد اور ڈابھے جی میں رہنے کا اتفاق ہوا اور آخر میں لاہور۔ ان علاقوں کے ماحول نے اُن کی شخصیت کی تعمیر اور تخریب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پربت کے دھندلکے، بہتے ہوئے دھارے اور رینگتے ہوئے سانپ بچپن ہی سے میراجی کے ذہن میں نقش ہیں۔ دُور پربت سے لٹکا ہوا کُہرا، اُنھیں نسائی پیکر سے لپٹا ہوا دامن دکھائی دیتا ہے۔ بچپن ہی سے میراجی کو عورت تو عورت، عورت کے لباس سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے لہنگے، اُس کی سیدھی ساخت، کمر سے ٹخنوں تک ایک جھول سا، میراجی کو ہلکی ہلکی لہروں کا ایک نازک جھرمٹ محسوس ہوتا ہے اور اُن کی نگاہوں میں پہنچنے والی ایک لچکتی ہوئی ٹہنی بن جاتی ہے۔ لہنگوں کے بعد اُن کا دوسرا پسندیدہ لباس ساڑھی ہے لیکن اس میں اُنھیں حرکت نظر نہیں آتی، بلکہ ایک ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے۔ ایک ایسا ٹھہراؤ جو کسی بگولے کی ہیئت میں محسوس ہو سکتا ہے اور:

> ''ساڑھی پہنے ہوئے کوئی نسائی پیکر میرے ذہن میں لٹکے ہوئے
> پردے یا چھائے ہوئے دھندلکے کا تصوّر لاتا ہے۔۔۔۔۔نسائی لباس کا یہ بیان
> زندگی کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے، یعنی عورت سے دُوری کا۔'' (3)

اور یہ دُوری ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا روگ اور المیہ بن جاتی ہے۔

میراجی نے اپنے اِس خود نوشت خاکے میں، قبل از وقت اپنے جنسی احساس کی بیداری کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک تو اپنے ساتھ کھیلنے والی بچی ''جمنا'' کے رفع حاجت کا واقعہ ہے، اِس بارے میراجی کی سوچ یہ ہے:

> ''اِس واقعے کی جنسی نوعیت کا ایک نقش زمانۂ طفلی ہی میں ذہن پر قائم ہو گیا۔'' (4)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 80 (1,1)

دوسرا واقعہ ذرا زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔وہ بیان کرتے ہیں:

''ساتھ کے مکان سے اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی کوئی سوغات کی چیز ہمارے ہاں لائی۔۔۔۔۔اُس نے دہلیز سے داخل ہو کر دیکھا۔کمرے میں کوئی نہیں، صرف میں ہوں۔مجھ سے پوچھا، میں نے اندر کی طرف اشارہ کیا کہ گھر کے لوگ اُدھر ہیں۔وہ چلی گئی لیکن ایک لمحہ ٹھٹھک کر کھڑے رہنے کے دوران میری نظر نیم جنسی احساسات کے ساتھ اُس پر جمی رہی۔اُس نے ایک سفید دھوتی پہن رکھی تھی اور دس گیارہ کی عمر۔شاید گھر کی بات ہونے کے خیال سے کوئی زیر جامہ نہ تھا۔چنانچہ سورج کی کرنیں لباس کے پردے میں چھنتے ہوئے زیریں جسم کے خطوط کا اظہار کر رہی تھیں۔''(5)

سکول کا زمانہ ہے۔ابھی جوانی نہیں آئی، مگر ان کا جنسی احساس جاگ گیا ہے اور دھوتی کے ہوتے ہوئے نظریں کم سن بچی کے زیریں جسم کے خطوط پر جمی ہیں۔میراجی تمام عمر اِسی قسم کے جنسی احساس کا شکار اور اسیر رہے۔میراجی اور عورت کے درمیان یہ ساڑھی اور دھوتی کا پردہ عمر بھر لٹکتا رہا اور وہ اس پردے کی اوٹ ہی سے عورت کے جسم کو دیکھتے اور ترستے رہے۔یہ جنسی اور ذہنی بھوک عمر بھر نہ مٹ سکی۔

سحاب قزلباش نے لکھا ہے:

''تم زندگی بھر عورت کے قرب کے لیے ترستے رہے۔۔۔۔۔اوٹ پٹانگ نظمیں کہہ ڈالیں اُس کے جسم پر''ذہنی بھوک''!''(6)

اور یہ بھوک میراجی کے چہرے کو اپنی گندگی میں لتھیڑتی رہی۔سندھ کے میدانوں سے میراجی کے ذہن پر اُداسی، بے زاری اور ویرانی کے نقش ثبت ہوئے تو لاہور میں قیام کے دوران، مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ جنس مخالف سے تعلق کے تجربے سے بھی گزرے اور اِس نتیجے پر پہنچے:

''عورت تیرا نام صدمہ ہے۔''(7)

اور یہ صدمہ عمر بھر اُن کے ساتھ رہا۔

محمد اکرام اللہ کامی نے''میرا بھائی''کے عنوان سے میراجی کا خاکہ لکھا ہے۔اِس خاکے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 81 (1,1)

میں زیادہ تر بچپن ہی کی باتوں کو دُہرایا ہے مگر اُن کی زندگی کے سب سے بڑے ”حادثے“ کا بھی بطورِ خاص ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جب ابھی ثناء اللہ صاحب دسویں جماعت میں لاہور میں پڑھتے تھے تو اُن کی زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا ہوا اور وہ ثناء اللہ سے میراجی ہو گئے۔ بقول کامی صاحب:

> ”یہ واقعہ یونیورسٹی گراؤنڈ کا ہے، یہاں پر ہر سال بنگالیوں کی سالانہ کھیلیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک سال اِسی موقع پر ثناء بھائی اور سلیم سوز گراؤنڈ میں بیٹھے تھے۔ ثناء اُن دِنوں دسویں میں ہوا کرتے تھے اور سلیم گورنمٹ کالج میں۔ کھیلوں کے دن بھی یہ وہیں تھے کہ اچانک دو بنگالی لڑکیاں اُن کے قریب سے گزریں۔ دونوں نے اُنھیں دیکھا اور پھر ہونی ہوئی اور ثناء بھائی میراجی بن گئے اور سلیم، سوز۔ اُن بنگالی لڑکیوں کے نام میرا سین اور پروتما گپتا تھے۔ میرا سین ایف سی کالج میں پڑھتی تھی جو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے قریب ہوا کرتا تھا۔ میراجی گھر سے کالج اور کالج سے گھر، ان گنت بار میرا سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر اُس کا پیچھا کیا کرتے اور یہ فاصلہ اُن کی زندگی میں صرف دو بار ٹوٹا۔ ایک اُس وقت جب کہ وہ راستے میں جا رہی تھی، میراجی جلدی سے بڑھے اور کہا ”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے“۔ اُس نے دیکھا اور پھر تیزی سے چلی گئی۔ اور دوسری دفعہ اُس وقت جب اُنھوں نے اُسے ایک خط دیا۔ صاف کاغذ پر صرف میرا لکھا تھا۔ اُس نے لے کر پڑھا اور چل دی۔ اُنھی دِنوں میراجی نے دسویں کا امتحان دیا اور ہر پرچے پر صرف اپنا رول نمبر لکھ کر چلے آتے رہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ اُن کی ہر بات بدل گئی۔ گویا اُنھوں نے نیا جنم لیا ہے۔“(8)

کامی صاحب کے بقول، میراجی کی زندگی کے اِس انقلابِ عظیم کی شروعات یونیورسٹی گراؤنڈ سے ہوئی، جب اچانک ایک دن میرا سین اپنی سہیلی کے ساتھ وہاں سے گزری۔ ثناء اللہ نے اُسے دیکھا اور ہونی ہو کر رہی اور ثناء اللہ، میراجی بن گئے۔ زندگی میں صرف دو دفعہ اُس سے نہ ہونے کے برابر بات ہوئی مگر زندگی اُس کے عشق میں گزار دی۔ یہ حادثہ اُس وقت ہوا جب میراجی ابھی دسویں جماعت میں تھے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 82 (1,1)

''میرا سین سے میراجی کی پہلی ملاقات 20 مارچ 1932ء کو ہوئی۔''(9)

میرا سین سے پہلی ملاقات کے وقت ثناء اللہ (میراجی) کی عمر تقریباً بیس برس ہے، مگر ابھی وہ دسویں جماعت ہی کے طالب علم ہیں۔ یہ بات کچھ کھٹکتی تو ہے مگر کامی صاحب نے جو جگہ اور جس طرح ملاقات ہوئی اور پھر گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک میرا سین کے پیچھے چلنے اور دو اُدھوری ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے اور کئی خاکہ نگاروں نے ان واقعات کی تصدیق کی ہے۔ تقریباً تمام خاکہ نگاروں نے میراجی کے میرا سین سے عشق کی رُوداد بیان کی ہے مگر ہر ایک کا مشاہدہ اور کہانی مختلف ہے۔

محمد حسن عسکری صاحب نے ''میراجی'' کے عنوان سے اُن کا خاکہ لکھا ہے۔ عسکری صاحب کی میراجی سے پہلی ملاقات مئی 1942ء میں دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس میں ہوئی۔ مگر اُنھوں نے میراجی کے میرا سین سے عشق کی رُوداد بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جب وہ آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے تو اُن کے ہر دوست کی ایک نہ ایک محبوبہ تھی۔ کوئی فارغ البال تھا تو بس میراجی۔۔۔۔۔ ایک دن کوئی بنگالی لڑکی ''میرا'' سامنے سے گزر رہی تھی۔ دوستوں نے یوں ہی مذاق میں کہہ دیا ''یہ ہے ان کی محبوبہ۔'' دو چار لڑکوں نے ''میرا'' کا نام لے کر اُنھیں چھیڑا اور وہ ایسے بنتے رہے جیسے واقعی چڑ رہے ہوں۔ پھر جب اُنھوں نے دیکھا کہ دوست اُنھیں ایک ''افسانہ'' بنا دینا چاہتے ہیں تو وہ بے تامل افسانہ ہی بن گئے۔ اُس کے بعد اُن کی ساری عمر اس ''افسانے'' کو نبھانے میں گزری۔''(10)

اِس اِقتباس سے تو یہ خبر ہوتی ہے کہ صرف دوستوں کے چڑانے، چھیڑنے اور اُنھیں ایک افسانہ بنا دینے کے سبب وہ بے تامل افسانہ بن گئے۔ یعنی میرا کو دیکھ کر اُن کے دل کی دھڑکنیں زیرزبر نہیں ہوئی تھیں بلکہ دوستوں کے تفنن طبع کی خاطر وہ افسانہ بنے اور ساری عمر اِس افسانے کو نبھانے میں گزار دی۔ محمد حسن عسکری صاحب نے چونکہ یہ باتیں کہیں سے سُن سُنا کر لکھی ہیں، اِس لیے یہ کہانی درست نہیں۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 83 (1,1)

اخلاق احمد دہلوی صاحب نے لاہور میں میراجی کے ہم جماعت اور دوست ڈاکٹر اے۔ڈی فرزدق صاحب کے حوالے سے، اُن کے میرا سین سے عشق کی کہانی لکھی ہے۔اخلاق احمد دہلوی صاحب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اے ڈی فرزوق کے مطابق:''ہم (ڈاکٹر موصوف اور میراجی) مزنگ کے ایک سکول میں آٹھویں سے دسویں جماعت تک ساتھ پڑھتے تھے۔ثناء (میراجی) صاحب میٹرک میں فیل ہو گئے اور میں پاس ہو کر ایف سی کالج میں داخل ہو گیا۔ثناء صاحب مجھ سے ملنے کالج آتے تھے۔۔۔۔۔کالج میں میری ایک ہم جماعت تھی میرا سین۔اتفاق سے میری اور میرا سین کی سیٹ برابر تھی۔۔۔۔۔اُنھیں میری ہم نشین میرا سین سے کچھ موانست ہو گئی۔۔۔۔۔ دیکھتے دیکھتے ثناء صاحب نے میرا سین کا اتنا اثر قبول کیا کہ خود اپنا نام اُس کے نام پر میراجی رکھ لیا۔ثناء صاحب روزانہ کوئی بیس پچیس قدم کے فاصلے سے میرا سین کے پیچھے پیچھے چلتے اور گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک اُسے پہنچا کر دم لیتے جس کی خود میرا سین کو آخیر دم تک خبر نہ ہو سکی۔''(11)

ڈاکٹر اے۔ڈی فرزوق صاحب کو بھی غلط فہمی ہوئی۔وہ سمجھتے ہیں کہ میراجی اُن سے ملنے ایف سی کالج آتے تھے اور یہیں اُنھیں میرا سین سے کچھ موانست ہو گئی۔حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ملنے کے بہانے، میرا سین ہی کے لیے کالج جاتے تھے۔میرا سین سے موانست کالج میں نہیں ہوئی بلکہ یہ ہونی بہت پہلے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہو چکی تھی۔جیسا کہ میراجی خود بیان کرتے ہیں:

''وہ (میرا سین) ایف سی کالج میں پڑھتی تھی۔ایک روز یونیورسٹی گراؤنڈ میں نظر آئی اور ایک پاکیزہ جذبہ اچانک میرے دل میں اُبھر آیا۔''(12)

''میرا سین سے میراجی کی پہلی ملاقات 20 مارچ 1932ء کو ہوئی اور پھر جب وہ کالج جاتی تو اُس کے پیچھے پیچھے ذرا فاصلے پر اُس کے ساتھ چلتے اور کالج سے واپسی پر بھی یہی عمل ہوتا۔'' اور یہ واقعات 38-1937ء کے ہیں۔(13)

کیا میرا سین چھ برس اس کالج میں پڑھتی رہی اور میراجی کے بھی یہ معمولات چھ برس

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 84 (1,1)

مسلسل جاری رہے؟ اور ان چھ برسوں میں صرف دو دفعہ بات کرنے کا یک طرفہ موقعہ اور دوسری جانب سے بے رُخی کا مظاہرہ۔ اِن دو واقعات کے باوجود کیا یہ بات بھی درست ہے کہ میرا سین کو آخیر وقت تک خبر نہ ہو سکی کہ کوئی مسلسل اُس کا پیچھا کر رہا ہے؟ کسی بھی خاکہ نگار نے اِس حوالے سے کچھ بھی نہیں لکھا البتہ اِس خاموش عشق، اندر کے الاؤ اور طبیعت کی بے چینی بارے میرا جی نے خود مظہر ممتاز کو یہ بتایا تھا کہ:

''کچھ دن بعد مجھ پر جنون طاری ہو گیا، سوائے میرا سین کے خیال اور تصوّر کے میں کسی اور بات میں دل چسپی نہ کرنے لگا۔ میں نے اپنا نام ثناء اللہ ڈار کی بجائے میرا سین کے نام پر میرا جی رکھ لیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ذہنی سکول ملا۔ اِس سکون کے لیے میں نے کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔''(14)

اِس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے اور تجزیہ بڑا دل چسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عام روایت یہ ہے کہ جوانی کے آغاز میں میرا جی نے ایک بنگالی لڑکی میرا سین کو دیکھا اور اُس کے عشق میں اِس درجہ اسیر ہوا کہ اُس نے نہ صرف اپنی ہیئت تبدیل کر لی، نہ صرف ثناء اللہ سے میرا جی بن گیا بلکہ محبوب کی ہر شے حتیٰ کہ اُس کی زبان، مذہب اور مذہبی روایات بھی اُسے عزیز ہو گئیں۔''(15)

یہ سوال اہم بھی ہے اور قابلِ غور بھی کہ میرا جی نے عشق میں مبتلا ہو کر ایسے عجیب و غریب ردِّ عمل کا اظہار کیوں کیا کہ محبوبہ سے کہیں زیادہ اُس کے مذہبی اعتقادات، رسوم اور فضا کو اپنی ذات سے ہم آہنگ کر لیا؟

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں:

''میرا سین زیادہ سے زیادہ ایک تحریک تھی جس نے میرا جی کے ہاں اُس چنگاری کو ہوا دی تھی جو ایک مُدّت سے اُس کے دل، روح بلکہ خون میں سلگ رہی تھی۔۔۔۔ پرانے ہندوستان کی طرف میرا جی کا رُجحان ایک بنیادی رُجحان تھا حتیٰ کہ میرا سین سے محبت بھی دراصل اُس رُجحان ہی کا ثمر تھی۔''(16)

اِس حوالے سے میرا جی کا اپنا کہنا ہے کہ:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 85 (1,1)

''ایک ہی بار مشرقی ہندوستان کی ایک عشرت انگیز عورت (یعنی میرا سین) کی طرف نظر کی اور ہزیمت کا مُنہ دیکھا۔۔۔۔۔۔اور ذہنی تلخی کو کم کرنے کے لیے اپنی شکست کے احساس سے رہائی حاصل کرنے کے لیے میرا ذہن ادبی تخلیقات میں مجھے بار بار پرانے ہندوستان کی طرف لے جاتا ہے۔''(17)

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی اِس وضاحت سے میراجی کے عشق، شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے مدد لی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے میراجی کی اِس ہزیمت کو یوں سُلجھایا ہے کہ میراجی خود بیان کرتے ہیں:

''میرا میرے لیے ایک سمبل تھی۔مجھے اُس کی محبت، اُس کی وفا کی ضرورت نہیں تھی۔''(18)

یہ وضاحتیں اور تاویلیں اپنی جگہ، مگر حقیقت یہ ہے کہ میراجی نے میرا سین سے عشق کیا اور خوب کیا۔ یہ الگ بات کہ اُن کے عشق کا انداز اپنا تھا۔اُن کی طبیعت میں ہر کام کرنے کا اپنا ڈھنگ اور طریقہ تھا۔اُن کا اپنا اصول تھا کہ ''میرا ذہن جو سوچتا ہے، میرا دل جو کہتا ہے، وہی کرتا ہوں۔''عشق میں بھی اُنھوں نے الگ راستہ تلاش کیا اور اظہار کا بھی الگ طریقہ اختیار کیا۔ممتاز مفتی، میراجی سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میراجی نے کہا:''ہمیں میرا سے محبت ہے۔اب ہم میرا ہیں۔''

ممتاز مفتی کہتے ہیں:''اُس کی بات سُن کر میں سکتے میں رہ گیا۔۔۔۔۔ عجیب آدمی ہے، میں نے سوچا، جو اپنی محبت کے راز کو یوں بیان کر رہا ہے جیسے وہ ''دو دُونی چارا ے'' کی طرح سنا رہا ہے۔اپنی محبت کو ''میراجی'' کے نام سے نشر کرنا، اپنے اصلی نام کو بھولنے کی شدید کوشش کرنا اور یوں جٹادھاری بن کر التزاماً عاشق کا رُوپ دھارنا، کتنا نمائشی انداز ہے؟''

مگر پھر ڈی۔ایچ لارنس کا خیال آتے ہی ممتاز مفتی نے محسوس کیا جیسے ''میرے روبرو بیٹھا ہوا وہ شخص (میراجی) بذاتِ خود ''معصوم دوشیزگی کا مجسمہ ہو'' اور ممتاز مفتی نے سوچا:

''کتنا بڑا ہے یہ شخص؟'' اور ممتاز مفتی کے کانوں میں میراجی کا قہقہہ گونجنے لگا ''ہمیں میرا

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 86 (1,1)

سے محبت ہے، اِس لیے ہم میرا جی ہیں۔"(19)

ممتاز مفتی صاحب نے تو اُسے ایک عجیب آدمی قرار دیا ہے جو اپنی محبت کو میرا جی کے نام سے نشر کرتا اور اپنے اصلی نام کو بھولنے کی شدید کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا ایک بہت سوچا سمجھا فیصلہ تھا اور ڈاکٹر رشید امجد کے بقول:

"یہ محض ڈرامہ نہیں تھا کیونکہ ساری زندگی دُکھوں کی نگری میں مارا مارا پھرنے والا مسافر اِتنا طویل ڈرامہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایک شخصیت کی متھ (Myth) کی تعمیر تھی جس کے لیے اُنھوں نے ثناءاللہ ڈار ہی کی قربانی نہیں دی بلکہ تمام ظاہری آرام و آسائش اور معمولات سے بھی کنارہ کشی کی۔"(20)

اور عصمت چغتائی بھی میرا جی کو ایک معصوم انسان قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں:

"یہ شخص بازی گر نہیں ہو سکتا، یہ ڈھونگ نہیں۔"(21)

واقعی یہ نہ کوئی ڈھونگ ہے نہ بازی گری، بلکہ ثناءاللہ ڈار کی محبت کا ایک انداز ہے جسے اُنھوں نے تمام عمر نبھایا۔

سحاب قزلباش کو میرا کی بے وفائی کی شکایت ہے مگر وہ اسے خوش قسمت بھی سمجھتی ہے۔ سحاب قزلباش لکھتی ہے:

"کیا مرد بھی اتنا چاہتا ہے کسی کو؟

"میرا! تُم کتنی خوش قسمت ہو۔ تمھیں معلوم ہو جائے تو اِس دھرتی پر پاؤں نہ رکھ سکو۔"(22)

میرا تو مرد کی اِس چاہت کو جان ہی نہ سکی اور اُس کے پاؤں اِس دھرتی کو ماپتے رہے، البتہ میرا جی کے پاؤں ایسے لڑکھڑائے کہ زندگی بھر سنبھل نہ سکے۔ عصمت چغتائی نے عورت کی ایک اور نظر سے میرا جی کے عشق کو دیکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"میرا جی کو میرا سین ملی جو اُن کا ملغوبہ بنا کر چلتی بنی۔ کہتے ہیں اُنھوں نے اُس کے نام پر ہی اپنا تخلص "میرا جی" رکھ ڈالا۔ انتہا ہے لیچڑ پن کی، کوئی بھی سمجھ دار لڑکی کسی اِتنے پھس پھسے مرد سے وابستہ ہونا پسند نہ کرے گی جو اُس کی

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 87 (1,1)

بیگم کا مقام پا کر فخر کرتا ہو۔‘‘(23)

خدا جانے سحاب قزلباش کی بات درست ہے یا عصمت چغتائی کی۔ یہ چاہت کی انتہا ہے یا لیچڑ پن۔ یہ عورتوں کی سوچ اور اُن کے دل کے معاملات ہیں، وہی بہتر جان سکتی ہیں مگر ایک بات ضرور ہے کہ زندگی بھر کوئی بھی عورت میراجی سے وابستہ نہ ہو سکی۔

میراسین کے علاوہ میراجی کے عشق کے اور قصّے بھی لوگوں نے بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے سید انصار ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

’’دہلی میں میراجی کو دو لڑکیوں میں خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ایک کو وہ پیار سے بلّی خانم اور دوسری کو بدلی یا بادلی بیگم کہا کرتے تھے۔ بلّی خانم کا اصل نام سحاب قزلباش تھا۔ وہ دہلی کے نامور شاعر آغا شاعر قزلباش کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ریڈیو میں اُس کی بنیادی نوکری تو اناؤنسر کی تھی لیکن وہ ڈراموں میں بھی کام کرتی تھی اور اِس حوالہ سے میراجی سے اُس کا ایک ’’دفتری تعلق‘‘ بھی تھا۔۔۔۔۔۔۔اُس کے گرد چاہنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ میراجی بھی اُن میں شامل تھے۔‘‘(24)

سحاب قزلباش نے بھی اِس ذہنی اور جنسی بھوکے شخص بارے لکھتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے:

’’میراجی، چپکے چپکے، جب بھی اُنھیں وقت ملتا مجھے گھورتے رہتے اور زندگی بھر ترستے رہے کہ میں اُن سے ڈھنگ سے بات کر لیتی۔‘‘(25)

سحاب قزلباش نے میراجی کی زندگی میں اُن کے لیے ایک لائن تک نہیں لکھی اور نہ اُن سے ڈھنگ سے بات کی کہ کہیں، بقول سحاب قزلباش اُن کی اُلٹ کھوپڑی کچھ اور ہی نہ سمجھ بیٹھے۔

سحاب قزلباش کے علاوہ میراجی اُس زمانے میں جس دوسری خاتون میں دل چسپی لیتے تھے وہ بدلی یا بادلی بیگم تھیں جن کا اصل نام صفیہ معینی تھا۔ اخلاق احمد دہلوی کے بقول:

’’یہ بڑی شوخ و شنگ خاتون تھیں، ڈرامہ آرٹسٹ تھیں۔ میراجی کے ڈراموں اور فیچروں میں اکثر کاسٹ ہوتی تھیں۔ اُنھیں دہلی کی BRIGHT

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 88 (1,1)

VOICE سمجھا جاتا تھا۔ان دونوں لڑکیوں میں میراجی کو اپنی مستقل محبوبہ میرا سین کے کچھ نقوش ملتے تھے۔میراجی کی صحت پر ان لڑکیوں کے عشق کا کافی بُرا اثر پڑا۔"(26)

سحاب قزلباش اور صفیہ معینی کے علاوہ میراجی کے عشق اور دل چسپی کی کہانی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے سیدانصار ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"اُن دونوں (سحاب قزلباش اور صفیہ معینی) کے علاوہ بھی کچھ خواتین تھیں جن میں میراجی دل چسپی لیتے تھے۔ایک خاتون امیتہ رائے تھیں۔ بنگالی تھیں۔ میراجی نے اُن پر ایک مزاحیہ نظم بھی لکھی تھی،جس کا ایک مصرع تھا: ؎

امیتا رائے پپیتا کھائے

اس خاتون کے بنگالی حُسن نے ریڈیو کے اکثر لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔چولی پہنتی، پیٹ ننگا، ساتھ ساڑھی، جب کمرے سے نکلتی، اُس کے چلنے کی آواز آتی تو میراجی جلدی سے کاریڈار کے آخری سرے پر پہنچ جاتے۔میں میراجی سے پوچھتا، کیا کر رہے ہو؟ کہتے،دیکھو'بلا آرہی ہے۔"

امیتا رائے کے علاوہ بھی کچھ اور بنگالی خواتین بھی تھیں، اپرن رائے، ریتا گنگولی،مس گھوش،جس میں میراجی دل چسپی لیتے تھے۔"(27)

میراجی کے عشق کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔تابش دہلوی لکھتے ہیں:

"میراجی نسوانی حسن سے بہت متاثر ہوتے اور یہ تاثر بعض وقت یہاں تک اُن پر جادو کرتا کہ وہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑتے اور لہولُہان ہو جاتے۔ایک صاحبہ جن کے نام کا ایک جزو اختر تھا،اُن کو بہت دردناک عذاب میں مبتلا رکھتیں۔ یہ صاحبہ مجھ (تابش) سے زیادہ مانوس تھیں اِس لیے میراجی مجھے تابش اختر کہتے۔"(28)

گو تابش دہلوی صاحب نے اِس واقعہ کی کوئی تفصیل نہیں لکھی کہ میراجی سے اُن کا تعلق کس نوعیت کا تھا اور وہ عذاب میں کس طرح مبتلا رکھتی تھیں؟ بہرحال مذکورہ خاتون میں میراجی کی دل چسپی کا قصّہ ضرور بیان کیا ہے۔مختار صدیقی صاحب نے اُن کے تین عشق بیان کیے ہیں۔ ایک تو وہی لاہور میں بنگالی ہندولڑکی 'میرا'، دوسری دِلی ریڈیو اسٹیشن کی چمپئی رنگ کی ایک تیز

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 89 (1,1)

طرار بنگالن مسلمان لڑکی اور تیسری کوشش ایک پارسی نژاد لڑکی تھی، اور بقول مختار صدیقی:

”پہلی اور دوسری کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی نامرادی کے اندھیروں میں گُم ہوگئی۔“(29)

اختر الایمان کے بقول اُس پارسی نژاد لڑکی کا نام مُنی رباڑی تھا۔(ڈاکٹر رشید امجد، ص 70)

اپنے اس عشق کی رُوداد مظہر ممتاز کو میراجی نے اِس طرح بتائی ہے:

”میں پیپلز تھیٹرز کے اداکاروں کو مکالمے ادا کرنے کا طریقہ بتایا کرتا تھا۔ وہاں ایک پارسی لڑکی بھی آتی تھی۔ بڑی خوب صورت، گول مول اور پیاری لڑکی تھی۔ مجھے یونہی پسند آگئی۔ میں نے سوچا اسی کے ساتھ زندگی کے آخری دن گزار دیں گے لیکن اُس کشمیری لونڈے وشوامتر عادل نے سارا معاملہ چوپٹ کردیا۔ وہ خود اُس سے عشق کرنے لگا اور وہ ظالم بھی اتنی ہی بے وفا نکلی کہ اُس کے خوب صورت جسم پر ریجھ گئی۔“(30)

اب پتہ نہیں اِسے عشق کہا جائے گا یا ایک عورت کے حصول کی کوشش، ہر صورت میں میراجی کے مقدر میں نامرادی کے اندھیرے ہی لکھے نظر آتے ہیں۔

احمد بشیر صاحب نے بھی میراجی کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”میراجی نے میرا سین سے بھرپور عشق کیا مگر اس کا عشق ناقابلِ فہم تھا۔ اُس نے عمر بھر میرا سین سے بات بھی نہ کی، اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور ساری زندگی اُس کے نام پر تج دی۔ میراجی نے میرا سے کوئی مقصد وابستہ نہیں کیا۔ اُس کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ فقط کچھ وقت چوروں کی طرح دیکھتا رہا اور پھر اُس کا نام اختیار کرکے، اُس سے اور دُنیا کی تمام عورتوں سے آزاد ہوگیا۔“(31)

احمد بشیر صاحب کا خیال ہے کہ میرا سین کا حصول میراجی کا مقصد ہی نہیں تھا۔ اُنھوں نے کبھی دل سے چاہا ہی نہ تھا کہ میرا سے عشق کا اظہار کریں۔ اُس کا مقصد تو:

”چھپ چھپ کر لذّت لینا تھا، میرا تو محض ایک بہانہ تھی۔“(32)

احمد بشیر صاحب کے مطابق اِس قسم کے بہانے زندگی میں اُس نے اور بھی بنائے،

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 90 (1,1)

جس میں ایک بہانہ ایک ادیب خاتون سے عشق تھا۔احمد بشیر صاحب نے اُس ادیب خاتون کانام ظاہر نہیں کیا،مگر''جو ملے تھے راستے میں'' کے مرتّب یونس جاوید صاحب نے فُٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ:

''بہت کریدنے کے بعد احمد بشیر صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ عورت عصمت چغتائی تھی۔''(33)

یہ بالکل ایک نیا انکشاف ہے۔میراجی کے کسی دوسرے خاکہ نگار نے اس عشق کا ذکر نہیں کیا اور احمد بشیر صاحب نے نام تو ظاہر نہیں کیا (وہ کام یونس جاوید صاحب نے کر دیا ہے) مگر عشق کی تفصیل ضرور لکھی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میراجی نے اُس خاتون ادیب (بقول یونس جاوید عصمت چغتائی) سے عشق کیا اور اپنے قول کے مطابق وہ اُن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔اُن سے میراجی کی ملاقات غالباً بمبئی جانے سے پہلے ہو چکی تھی لیکن بمبئی جانے کے بعد یہ عشق نما بہانہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔یہ کہانی بھی میرا کی کہانی سے ملتی جُلتی ہے مگر یہ خاتون میراجی سے بڑی شفقت سے پیش آتی تھی۔میراجی کو یک دم خیال آیا کہ اُن سے شادی کرنی چاہیے۔چند مہینے وہ اِس فکر میں غلطاں رہا کہ شادی کرنا بھی چاہیے کہ نہیں۔اس فکر کے دوران اُس نے اُس خاتون سے ملنا چھوڑ دیا۔آخر کار وہ اِس فیصلہ پر پہنچا کہ شادی کی بات ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔چنانچہ وہ اُن کے گھر پہنچا۔خاتون حسبِ سابق نہایت اخلاق سے پیش آئی اور اُس سے نہ آنے کا شکوہ کیا۔میراجی ابھی بات کرنے کے لیے گلا صاف کر رہا تھا کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے اور خاتون نے کہا: میرے شوہر۔۔۔۔اِن سے ملیے۔''میراجی بات کیے بغیر اُٹھ کر چلا آیا۔''(34)

اِس اِقتباس سے تو پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ خاتون سے میراجی کی ملاقاتیں بمبئی آنے سے پہلے ہو چکی تھیں۔اس کا رویّہ بھی بڑا شفقت آمیز تھا اور میراجی نے بھی اُن سے''قول قرار'' کر رکھے تھے جس کی بنا پر اُنھیں شادی کا بھی خیال آیا مگر چند ماہ غور و فکر میں گزر گئے اور اِس دوران پانی سر سے گزر گیا۔احمد بشیر صاحب نے اس عشق کے انجام پر تبصرہ بھی کیا ہے۔لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 91 (1,1)

''میراجی کو تو اِس بات کا رنج بھی نہ ہوا ہو گا کیونکہ دراصل اُس کو اس خاتون سے عشق نہ تھا۔ اُسے شادی کی ضرورت اور آرزو ہی نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے اِس جذبے کا ذکر کسی تاثر کے اظہار کے بغیر کیا کرتا تھا۔''(35)

چند سطر پہلے احمد بشیر صاحب اِس ''عشق'' کا ذکر فرما رہے ہیں اور شادی بارے میراجی کے قول کا ذکر بھی کر رہے ہیں اور تبصرے میں کہا جا رہا ہے کہ اُنھیں نہ عشق اور نہ شادی کی ضرورت اور نہ آرزو۔ حالانکہ وہ چند ماہ اِس فکر میں غلطاں بھی رہے اور بڑی سوچ بچار کے بعد شادی کی بات کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ اور خاتوں سے اتنا تعلق ہونے کے باوجود بے خبری اِتنی کہ اُس کی شادی کی خبر تک بھی نہ ہوئی۔ اور آخر میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ باتیں میراجی خود بغیر کسی جذبے کے کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس فرضی عشق کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ عصمت چغتائی نے میراجی کا جو خاکہ لکھا ہے اُس میں اُنھوں نے بڑی وضاحت سے میراجی سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ ملاقاتیں بھی اُس وقت ہوئیں جب عصمت چغتائی کی شاہد لطیف سے شادی ہو چکی تھی۔ پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب میراجی اُن کے گھر کے دروازے تک آئے۔ وہ شاہد لطیف سے ملنے آئے تھے۔ شاہد لطیف گھر پر نہیں تھے اور دروازہ عصمت چغتائی نے کھولا۔ پھر کیا ہوا، وہ لکھتی ہیں:

''گھنٹی بجی، میں نے دروازہ کھولا۔ ایک میلا کچیلا بدبودار انسان، دو سیڑھیاں چڑھ کر ٹھٹھک گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ منہ کھلا مگر آواز نہ نکلی۔ جیسے اُس نے ایک دم کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ آئیے، اُوپر آجائیے۔ میں نے کہا۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ بغل میں دبی ہوئی فائل لرزتے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی، مُنہ سانس لینے کے لیے کھولا، لب پھڑپھڑائے۔ فائل اُٹھانے کو جھکا تو ہاتھ سے دو لوہے کے گولے چھوٹ کر سیڑھیوں سے لڑھک گئے۔ اُس نے پھر زخمی کبوتر کی طرح مجھے سہم کر دیکھا، جلدی سے فائل سمیٹی۔ کاغذ اُلٹے سیدھے ٹھونسے اور گولے سمیٹنے لگا۔ ایک سسکی سی اُس کے منہ سے نکلی اور وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ کر سرپٹ بھاگا۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 92 (1,1)

نہ جانے کون مسخرا ہے؟ میں بالکنی سے اُسے پھاٹک کی طرف لپکتا دیکھتی رہی۔" (36)

یہ پہلی ملاقات ہے اور اُس وقت تک وہ میراجی کو جانتی تک نہیں تھی۔ شاہد لطیف، منٹو کے ہمراہ گھر آئے تو اجنبی کا حُلیہ بیان کرنے پر اُنھوں نے کہا "ارے میراجی ہوگا۔" اور عصمت چغتائی اُسے ایک مسخرا اور چمرخ چوہا کہہ رہی ہے۔ میراجی سے عصمت چغتائی کی دوسری اور آخری ملاقات ایک فلمی دعوت میں ہوئی۔ وہ بھیڑ میں بھی کچھا کیلے سے تھے اور ایک صوفے کے کونے پر تنہا بیٹھے تھے۔ عصمت چغتائی ایک دم سے جا کر اُن کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ ایسے اُچھلے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ممکن تھا کہ وہ بھاگ جاتے مگر عصمت چغتائی نے دھمکی کے انداز میں کہا:

"بھاگنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ ورنہ ہاتھ پکڑلوں گی اور آپ چھڑا نہیں پائیں گے۔۔۔۔۔ اور سب کہیں گے کہ بدنام زمانہ ادیبہ نے بھری سبھا میں میرا جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بڑا مذاق اُڑے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا، مگر آپ بدنام ہو جائیں گے۔" وہ کچھ نہ بولے۔" (37)

اِس ملاقات میں اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں ہوئی ہیں اور زیادہ تر عصمت چغتائی نے ہی کی ہیں۔ اور پھر جیسے ہی عصمت کی تھوڑی سی توجہ ہٹی تو میراجی "پھُر"۔ دُور دُور نام ونشان نہ تھا۔ عصمت چغتائی کو وہ بڑے معصوم، دُکھی اور غم کے مارے انسان معلوم ہوئے، جس پر اُنھیں رہ رہ کر ترس آتا ہے۔ اس کے بعد میراجی سے پھر کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔

گو بحث ذرا تھوڑی سی طویل ہوگئی ہے مگر دکھانا یہ مقصود تھا کہ ان دو کے سوا، عصمت اور میراجی کی کبھی کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ تو پھر کہاں کا عشق، کہاں کے قول وقرار، کہاں شفقت آمیز ملاقاتوں کا سلسلہ اور کہاں عصمت کے گھر شادی کا پیغام لے کر جانے کا قصّہ؟ اگر احمد بشیر صاحب کو یہ باتیں میراجی نے خود بتائی ہیں تو تب بھی غلط اور اگر احمد بشیر صاحب نے کہیں اور سے سُن کر لکھی ہیں تو تب بھی درست نہیں۔ ویسے بھی عصمت چغتائی کو تو میراسین سے میراجی کے عشق اور اُس کے نام پر اپنا تخلّص رکھنے پر اعتراض ہے اور اسے لیچڑ پن سمجھتی ہیں۔ اور اُن کی واضح اور

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 93 (1,1)

دو ٹوک رائے ہے کہ:

''کوئی بھی سمجھ دار لڑکی کسی اتنے پھُس پھُسے مرد سے وابستہ ہونا پسند کرے گی جو اپنی بیگم کا مقام پا کر فخر کرتا ہو؟'' (38)

تو عصمت چغتائی بذاتِ خود اس پھُس پھُسے مرد سے وابستہ ہونے کا کیسے سوچ سکتی ہے؟ وہ میراجی سے ہمدردی کو کر سکتی ہے، اُس کا غم تو کھا سکتی ہے مگر اُس سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اور میراجی نے بھی عصمت چغتائی کو کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا، البتہ خط ضرور لکھا ہے جس میں بڑی لجاجت سے لکھا تھا:

''خدا کا واسطہ میری شادی کروا دیجیے بھنگن ہو، چماری ہو، بس عورت ہو۔'' (39)

اِس سلسلے میں عصمت چغتائی تو کوئی مدد نہیں کر سکی مگر میراجی نے خود ایک بار کوشش ضرور کی ہے، کیونکہ دُلہن پانے اور دیکھنے کی اُنھیں شدید تمنا تھی اور اپنی بیٹی دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔

عصمت چغتائی تو نہیں البتہ صفیہ معینی (بادلی بیگم) کو میراجی نے شادی کی پیش کش کی تھی اور کسی قسم کا تکلف برتنے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں رابطہ کیا۔ میراجی کو خوش فہمی تھی کہ اُسے ہم سے گونہ رغبت ہے اِس لیے تکلف کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر بقول سحاب قزلباش:

''جب اُس نے یہ مژدہ سنا تو ایک انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی جو خاصی دیر کانپتی رہی۔ کچھ دیر تو آنکھیں پھاڑے اِس دُنیا میں نہ رہی، جب واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ڈرامہ میں لڑائی کے پارٹ کی ریہرسل کر رہی ہے۔ اُس کے الفاظ کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں۔ مُوا شاعر بنا پھرتا ہے۔ تبھی ریہرسل میں مجھے پان دیتا اور جب دیکھو گھورتا رہتا ہے۔ کہاں گیا وہ ''میرا'' کا عشق تبھی اُس نے مُنہ نہ لگایا۔ شکل تو دیکھو، داڑھی بڑھائے موا جوگی۔ لو اور سُنو بہن میری قسمت میں یہی لکھا ہے کیا؟ سب نے سُنا۔ کچھ ہنس دیے، کچھ اُداس، کچھ حیران۔ مجھے تو جیسے معلوم تھا کہ ایسا سوچنا بے کار ہے۔'' (40)

یہ الفاظ میراجی نے بھی سُنے اور کئی روز جے جے ونتی کا ریکارڈ سُنے بغیر روتے رہے۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 94 (1,1)

اور بقول سحاب قزلباش:

''تم ہار کر اِتنا تھک گئے تھے کہ کسی نے کہا آٹھ روز تک تم نے کچھ بھی نہ کھایا، شراب پیتے رہتے رات بھر۔''(41)

مگر ایک صحت مند اثر یہ ہوا کہ اُنھوں نے اپنا حُلیہ بہت حد تک درست کرلیا۔ داڑھی مُنڈ وا دی، بال کٹوا لیے اور عام لوگوں جیسا لباس پہننے لگے۔ سحاب قزلباش اِس تبدیلی بارے لکھتی ہیں:

''پندرہ بیس دن کی چُھٹی کے بعد واپس آئے تو لوگ میراجی کو نہ پہچان سکے۔ اُنھیں احساس ہو گیا تھا سب ظاہرداری کو پسند کرتے ہیں۔ وہ دن گئے جب راکھ میں جُٹی زلفیں، گلے میں پڑی مالاؤں میں سُندریاں لپٹ جاتی تھیں ۔۔۔۔۔۔ لمبے لمبے بال، داڑھی سب غائب، کینچلی تو اُنھوں نے لاکھ بدل ڈالی مگر یہ رُوپ بھی بے کار ثابت ہوا۔''(42)

یعنی میراجی کی اِس تبدیلی کا بادلی بیگم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ میراجی کے لکھے ہوئے ڈراموں میں اُسی طرح پارٹ ادا کرتی رہی، مگر اُس نے اِس موضوع کے متعلق یہ کہہ کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا کہ:

''اِس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں میراجی کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں۔''(43)

بادلی بیگم کے اِس رویّے کے بعد میراجی شادی کے اِس معاملے سے خاموشی سے الگ ہو گئے۔ اُن کے دل کو ٹھیس تو پہنچی مگر بادلی بیگم کے لیے کسی طرح کی نفرت پیدا نہ ہوئی۔ میراجی ڈرامے لکھتے رہے۔ وہ بدستور اُن کے ڈراموں میں کام کرتی رہی اور مسکرا مسکرا کر اُن سے لے کر پان کھاتی رہی۔ ایک عرصے کے بعد ایک سنگین واقعہ ہوا۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

''ایک عرصے کے بعد بادلی بیگم حاملہ ہو گئی۔ متعلقہ شخص نے شادی سے انکار کر دیا۔ میراجی کو معلوم ہوا تو محض اِس خیال سے کہ بیگم کی عزت پر حرف آئے گا اور پیدا ہونے والا بچہ حرامی کہلائے گا، شادی پر تیار ہو گئے۔ لیکن قیوم نظر نے یہ شادی نہ ہونے دی۔ قیوم نظر نے بڑی مشکلوں سے میراجی کو اِس ارادے سے باز رکھا۔''(44)

عورت کے قرب کے لیے ترساہٹ اپنی جگہ، مگر میراجی کی یہ مثبت سوچ اور رویّہ اُن

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 95 (1,1)

کی عظمت کی دلیل ہے۔

اکرام اللہ کامی، میراجی کے بھائی نے لکھا ہے کہ ’’میرا سین کے عشق کے بعد میراجی سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ اُن کی ہر بات بدل گئی، گویا اُنھوں نے ایک نیا جنم لیا۔ اس نئے جنم میں اُنھیں اپنے سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اِس عشق میں پہلا کام تو یہ کیا کہ اُس کے نام پر اپنا نام رکھ لیا اور پھر اُس کی تقلید میں بال بڑھا لیے اور بقول محمود نظامی:

’’میرا کے گیان دھیان نے اُنھیں ایسا بے سُدھ کیا کہ اُنھیں نہانے دھونے اور لباس کا بھی ہوش نہ رہا۔ زندگی کے تمام مشاغل ختم ہوئے۔‘‘(45)

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

’’میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ اُنھیں کبھی کسی نے نہاتے ہوئے نہیں دیکھا، بلکہ مُنہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے۔ کبھی نہ تیل ڈالتے اور نہ اُنھیں بناتے۔۔۔۔ سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ اُن کے غلیظ پن سے بڑی گھن آتی تھی۔۔۔۔ گرمیوں میں بھی گرم کوٹ پہنتے، نہایت موٹے اور بھدے ٹوکا اچکن نما کوٹ اور اُسی کا پتلون۔ جاڑا، گرمی سب میں یہی گرم لباس چلتا۔‘‘(46)

شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

’’وہ عجیب الخلقت انسان تھا جو گرمیوں میں جاڑے کے کپڑے پہنے ہوئے، ہاتھ میں مداریوں کے گولے لیے، گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں ڈالے لمبے لمبے بال اُلجھائے، میرابائی کے بھجن گاتا۔‘‘(47)

اخلاق احمد دہلوی کہتے ہیں:

’’میراجی پتلون بغیر جیبوں کی پہنتے اور شیروانی کی جیبوں میں اپنے غیر مطبوعہ مسودات، فلم ایکٹرسوں کی نیم برہنہ تصویروں، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، استعمال شدہ سوبافوں کے ملغوبے سے تھیلا سا بنائے رکھتے۔ موسموں کے لحاظ سے کبھی نہ پہنتے اور سامان مطلق نہ رکھتے۔ نہ تکیہ، نہ بستر نہ چارپائی۔‘‘(48)

منٹو کو اِس ہیئت کذائی اور رویّے میں رہبانیت اور درویشانہ پن نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 96 (1,1)

''اِس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے۔ لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکتے تھے۔ فرنچ کٹ سی داڑھی، میل سے بھرے ناخن۔۔۔۔۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اُس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔۔۔لیکن اُس کی غلاظت، اُس کے لمبے بال، اُس کی فرنچ کٹ داڑھی، گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گولے اُس کے معاشی حالات کے مظہر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اُن میں ایک درویشانہ پن تھا۔ ایک قسم کی رہبانیت۔''(49)

مختار صدیقی میراجی کو ایک باغی قرار دیتے ہیں۔ ایسا باغی جس نے سماج، مذہب اور کہنہ روایات کی بوسیدگی سے بغاوت کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس معاشرے نے اُنھیں پیدا کیا اور پروان چڑھایا اُس سے متنفّر اور باغی تھے لیکن یہ بغاوت اپنی ذات تک محدود تھی۔''(50)

گویہ بغاوت اُن کی اپنی ذات تک محدود تھی مگر اس بغاوت کا انجام بقول ممتاز مفتی یہ ہوا کہ:

''میراجی نے انتقاماً خود اپنی شخصیت کے پرزے پرزے کر کے اُنھیں اُڑا دیا، بکھیر دیا۔ غصّے کے چھچے سے اپنی شخصیت کو انڈے کی طرح پھینٹ دیا۔ انوکھی گھمن گھیریوں میں گھما دیا اور پھر میراجی نے فاتحانہ انداز سے سر اُٹھایا۔۔۔۔۔۔
''ایسے ہی ہیں، نہیں ایسے نہیں، اس سے بھی بدتر ہیں، ہاں کرلو ہمارا کیا کرتے ہو۔''
(51)

کسی نے کیا کرنا تھا؟ اُنھوں نے اپنے ساتھ جو کیا خود ہی کیا۔

تابش دہلوی کہتے ہیں:

''وہ سچے آدمی تھے اور اسی سچائی کو ہر جگہ دیکھنا چاہتے تھے۔ دُنیا اور دُنیا کے تعلقات میں، فطرت میں، ذہن و فکر میں اور اُن کے خدوخال میں۔ غرض اپنے اِردگرد کی ہر چیز کو وہ اپنے ذہن کی مطابقت سے دیکھنا پسند کرتے۔''(52)

ایسا ممکن نہیں تھا مگر اس کی سوچ یہی تھی۔ شاید اسی لیے منٹو نے اُسے ایک ایسا بھٹکا ہوا مسافر کہا ہے جو نگری نگری گھوم رہا ہے۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 97 (1,1)

''منزلیں قدم قدم پر اپنی آغوش اُس کے لیے وا کرتی ہیں۔ مگر وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جارہا ہے۔۔۔۔کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ۔۔۔۔ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔''(53)

احمد بشیر بھی اُنھیں ایک ایسا بھٹکا ہوا راہی قرار دیتے ہیں جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''اُس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اُس کو صرف چلتے رہنے سے کام تھا۔ اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے پیر سوجے ہوئے تھے۔ تلووں سے خون رِستا تھا۔ مگر وہ صحرائی بگولے کی طرح جنگل جنگل پھرتا رہا۔ نہ اُس نے کسی سے راستہ پوچھا نہ کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔''(54)

وہ بظاہر بھٹکا ہوا راہی جس کا کام صرف چلنا تھا، جس کی کوئی منزل نہ تھی، اُس نے اپنی منزل کا سراغ اپنے من میں تلاش کرلیا۔ زندگی کے پے درپے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر اُس نے اپنی ہی ذات میں پناہ ڈھونڈ لی۔ قدرت اللہ شہاب کے مطابق:

''میرا جی نے زندگی کے خونی بھیڑیے سے بھاگنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اُسے اُس کے اپنے نہاں خانوں میں لے گیا۔ نہاں خانہ خواہ دل کا ہو یا دماغ کا اکثر تاریک ہوتا ہے۔''(55)

ان تاریک راستوں کا انتخاب کرنے کے بعد اُس ''باغی'' نے انتقام کے لیے بھی اپنی ذات ہی کو منتخب کیا۔ لباس اور جسم کی صفائی سے تو وہ پہلے ہی لاپروا ہو چکے تھے، پھر خود لذّتی اور شراب کا بھی شکار ہو کے رہ گئے۔ شاہد احمد دہلوی کا بیان ہے کہ:

''میرا جی جنسی اعتبار سے ایک گنجلک تھے۔ خدا جانے استمنا بالید کا اُنھیں چسکا کہاں سے لگا کہ جیتے جی نہ چُھوٹا اور اُنھیں کسی جوگا نہ رکھا۔''(56)

اِس عمل پر شرم سار ہونے کی بجائے وہ اسے فخریہ بیان کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اس کی بدولت میری سب تمنّائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی اِس امر کی وضاحت کرتے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 98 (1,1)

ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہمیں کہتے:

’’آپ ایک ایک کا مُنہ تکتے اور دل میں حسرت لیے رہ جاتے ہیں۔ میں کسی کو دیکھتا ہوں تو اُس کا لطف بھی حاصل کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔جب کہا جاتا کہ یہ تو بڑی غلط چیز ہے تو جواب ملتا کہ میں سائنٹفک طریقے کا دست کار ہوں۔ اِس دست کاری میں اُنھیں اِتنا غلو تھا کہ قیدِ مقام سے بھی گزر چکے تھے۔ اُن کے پتلون کی بائیں جیب تو بنی ہوئی تھی مگر جیب کا کپڑا غائب تھا۔‘‘(57)

میرا جی چونکہ عام انسانوں سے مختلف تھے یا مختلف نظر آنا چاہتے تھے، اِس لیے اُن کا لذّت کا تصوّر اور لذّت کے ذرائع بھی مختلف تھے۔ لذّت کے حصول کے لیے اُسے عورت سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا بلکہ وہ عورت کو اِس عمل کے لیے ایک بے معنی اور مجہول شے سمجھتے۔ احمد بشیر صاحب کے نزدیک عشق وِشق اپنی جگہ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو کسی بندش میں گرفتار سمجھتے ہی نہ تھے۔ اُن کا نروان اُن کی اپنی اَنا کی لذّت میں تھا۔ احمد بشیر صاحب کے بقول:

’’میرا جی لذّت کا غلام تھا۔۔۔۔اُس نے اپنے شبستانِ عیش کے دروازے صرف اپنی ذات ہی پر کھولے تھے اور کسی کو اس میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دُنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز اپنی ذات میں چُھپ کے چوری چوری لذّت لیتا رہا۔۔۔۔اُس نے لذّت کشی کے تمام تقاضے پورے کیے۔۔۔۔۔لذّت کے تقاضے پورے کرنے میں اُسے بہت دسترس حاصل تھی بلکہ اس سلسلے میں اُسے ’’یدِ بیضا‘‘ عطا ہوا تھا۔ وہ اپنے ید بیضا کا بڑے شوق اور اعتماد سے ذکر کیا کرتا تھا۔‘‘(58)

شاید یہی سبب تھا کہ میرا جی اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔ اَنا پرستی، لذّت پرستی، ہیئت کذائی، لباس اور زندگی کی دوسری اُلجھنوں نے اُنھیں ایک پُراسرار شخصیت بنا دیا تھا۔

میرا سے ثناء اللہ کا وصال نہ ہوا نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کا ردِّ عمل میرا جی خود تھا۔ اور صورتِ حال یہ تھی کہ محبوب سے وصال کے لیے محبوب کا وجود بھی لازم نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی عاشق، خود ہی معشوق اور خود ہی وصال تھے۔ میرا جی کی جنسی اجابت بارے منٹو لکھتے ہیں:

’’اُس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اُس کی جنسی اجابت عام طور پر

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 99 (1,1)

ریڈیو سٹیشن کے اسٹوڈیو میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کرلیا کرتا تھا۔‘‘(59)

اِس عمل سے منٹو نے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

’’وہ اشخاص جو اپنی خواہشاتِ جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر مخلص ہوتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکہ دیتے ہیں مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔‘‘(60)

منٹو میراجی کو ایک دل چسپ اور پرلے درجے کا مخلص انسان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

’’میراجی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی اور اُسے نبھایا۔ اپنی زندگی میں ایک عظیم ترین خواہش کو جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکہ فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اِس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔‘‘(61)

بہر حال اِس دل چسپ، بے ضرر اور مخلص انسان نے خود کو زندگی بھر اذیّت بھی بڑے خلوص سے دی۔ خود کو اذیّت دینے میں خود لذّتی کے ساتھ ساتھ شراب نے بھی پورا ساتھ دیا۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

’’شراب نوشی کی لت خدا جانے میرا کو کہاں سے لگی۔۔۔۔۔۔ پہلے رات کو پیتے تھے پھر دن کو بھی پینے لگے۔ سوڈا یا پانی ملانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ یونہی بوتل سے مُنہ لگا کر غٹا غٹ چڑھا جاتے تھے۔‘‘(62)

منٹو صاحب کہتے ہیں، اُنھوں نے شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ۔ شراب پی کر کبھی کسی نالی میں گرے ہیں اور کبھی کسی سڑک پر بے ہوش پڑے ہیں۔ اخلاق احمد دہلوی اور شاہد احمد دہلوی نے اُن کی بے ہوشی کے قصّے بیان کیے ہیں۔ اخلاق احمد دہلوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

’’کئی کئی لڑکیوں سے ایک ہی وقت میں عشق کرنے کے باوجود ایک

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 100 (1,1)

ہی لڑکی ''میرا سین'' کے عشق کی مالا جپتے اور اسی طرح ساری شرابیں ملا کر ہر قماش کے لوگوں کے ساتھ پیتے۔''(63)

پیسے پاس نہ ہوتے تو دوست احباب سے مانگ کر شراب خرید کر پیتے۔ منٹو صاحب لکھتے ہیں:

''بہت دیر تک اُس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہو گیا۔۔۔اس کے لیے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔ سات روپے میں رم کا اڈھا آتا تھا۔ باقی آٹھ آنے اُس کے آنے جانے کے لیے ہوتے تھے۔''(64)

اور جب فلم انڈسٹری کے حالات خراب ہونے کے سبب منٹو صاحب کا بھی ہاتھ کچھ تنگ ہو گیا اور میرا جی کی شراب کا خرچہ برداشت کرنے کے قابل نہ رہے تو میرا جی نے ''بھنگ'' کھانی شروع کر دی۔ اِس خود لذّتی اور شراب نوشی نے اس معصوم اور بے ضرر انسان کو ایسی اخلاقی پستیوں میں گرا دیا کہ میرا جی ایک غلیظ پیکر کی مستقل صورت بن کر رہ گئے۔

انتظار حسین لکھتے ہیں:

''میرا جی گرمیوں میں اوورکوٹ پہنتے تھے، میرا جی کے ناخنوں میں میل پھنسا رہتا تھا، میرا جی ہاتھ میں تین آہنی گولے رکھتے تھے، میرا جی نے میرا سے عشق کیا۔ میرا جی شراب پیتے تھے۔۔۔ یہ سب واقعات ہیں۔ یہ تمام تجربے کن کیفیات سے گزر کر شاعر کے لیے واردات بنتے ہیں؟ ذات کی گہرائی میں کس کس جذبے اور کس کس خیال سے مل کر نیا جنم لیتے ہیں؟ اصل بات تو جاننے کی وہ ہے۔''(65)

انتظار حسین صاحب نے مزید لکھا ہے کہ:

''وہ اپنے تجربات کے بارِ گراں میں ہمارے لیے زندگی بسر کر گیا۔ اُس کو سراہنا ہمارے ذمے ہے، ہمارا فرض ہے۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

(66)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 101 (1,1)

مقامِ شکر ہے کہ ہمارے ناقدین اور خاکہ نگاروں نے اس فرض کو خوب نبھایا ہے۔ میرا جی کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کے طور طریقوں کو بھی بیان کیا۔ اُن کی شخصیت کی من جملہ خرابیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیوں کو بھی شمار کیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ:

> ''میرا جی کی شخصیت میں بیسیوں خرابیاں آ گئی تھیں، لیکن طبعاً وہ ایک شریف انسان تھے۔ دوستوں کے لیے دامے، درمے، قدمے ہر طرح کی خدمت کرنے کو تیار رہتے تھے۔۔۔۔۔میرا جی کو میں نے کبھی کسی سے بدزبانی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ کسی سے مذاق تک نہیں کرتے تھے۔ ادب آداب ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ اُن کی بھونڈی وضع قطع پر بے تکلف دوست پھبتیاں کستے مگر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی الٹ کر کوئی سخت جواب نہ دیتے۔۔۔۔اُنھیں دیکھ کر اندر سے دل کہتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے۔ اِتنی نفرت انگیزیوں کے باوجود دل اُس کی طرف کھنچتا تھا۔ ایسا مقناطیسی شخصیت کا انسان میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔''(67)

شاہد احمد دہلوی صاحب نے اُنھیں ایک مقناطیسی شخصیت رکھنے والا عظیم انسان قرار دیا ہے۔ اِس لیے کہ میرا جی کا ظاہر باطن ایک تھا۔ اُنھوں نے کبھی اپنے عیبوں کو نہیں چھپایا، نہ کبھی اپنی خوبیوں کے قصّے بیان کر کے داد طلب کی۔ ریاکاری اُن میں نام کو نہیں تھی۔ میرا جی کی اَنا پرستی کے باوجود احمد بشیر صاحب اُن کی گفتگو میں وضع داری کے قائل ہیں۔ اُن کے بقول:

> ''بات چیت کے رکھ رکھاؤ میں بہت محتاط تھا۔ انتہائی غصّے میں بھی اُس کی زبان سے کسی کے لیے ''تم'' کا لفظ نہ نکلتا تھا۔۔۔۔۔اور انتہائی بے تکلفی کے باوجود حفظِ مراتب کی کڑی حدود میں رہتا تھا۔''(68)

ڈاکٹر عبادت بریلوی میرا جی کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''میرا جی بلا کے ذہین تھے، اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہر موضوع پر اپنی مخصوص رائے رکھتے تھے۔ مزاج میں بے باکی تھی مگر انداز دھیما اور نرم۔ وہ بہت صاف گو تھے اور کوئی بات چھپا نہیں سکتے تھے۔ اور مزاج میں سادگی تھی۔ یہاں

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 102 (1,1)

تک کہ اُنھیں اپنی اہمیت کا احساس نہیں تھا۔‘‘(69)

منٹو اُن کے اندازِ گفتگو اور اِنسانی رویّے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ اُس کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں تھے اور اُس کی باتوں میں کوئی اُلجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔وہ پرلے درجے کا ایسا مخلص انسان تھا جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا بھی مطلق احساس نہیں تھا۔‘‘(70)

میراجی کو لباس پہننے کا سلیقہ تھا یا نہیں تھا مگر بات کرنے اور لوگوں سے ملنے ملانے کا سلیقہ ضرور تھا اور وہ انسان کو انسان سمجھ کر ہی ملتے تھے۔ اخلاق احمد دہلوی اِس بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

’’میراجی تقریباً چھ برس تک باقاعدہ دِلّی رہے اور دِلّی کے ادیبوں سے لے کر دِلّی کے تانگے والوں اور فقیروں تک سے یکساں سلوک کے ساتھ ملتے رہے۔ وہ انسان انسان میں فرق کرنا نہیں جانتے تھے۔ کہتے تھے گاندھی جی چاہے بھنگی کالونی میں رہیں یا بھنگی گاندھی کالونی میں رہے، میرے لیے سب برابر ہیں۔‘‘(71)

یہ کوئی معمولی رویّہ نہیں ہے اور نہ ایسا رویّہ اور طرزِ عمل کسی عام اور معمولی آدمی کا ہوسکتا ہے۔ یہ اُن کا کام ہے جن کے حوصلے ہوں زیادہ، جو انسان کی بطور انسان عزت اور عظمت کے قائل ہوں۔ میراجی ’’فرعون باسامان‘‘ قسم کے افسروں کا آملیٹ بنانے کا ہُنر جانتے تھے اور اُنھیں چیلنج کر کے، وارننگ دے کر اور بتا کر اُن کا آملیٹ بناتے تھے، مگر عام آدمی کی خدمت اور ہمدردی میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ مختار صدیقی لکھتے ہیں:

’’دوستوں کا ذکر کیا، ساتھی کارکنوں اور معمولی شناساؤں کے لیے وہ اِتنا کچھ کرتے تھے کہ ہم دوستوں کے لیے کرسکیں تو بہت بڑا احسان کریں۔ لوگوں کی عرضیاں لکھنے لکھوانے سے لے کر، قرضے کا اہتمام کرنا، اُن کی دفتری اور غیر دفتری اُلجھن سلجھانا، ہومیو پیتھی کی دوا مہیا کرنا۔ اُن میں ادبی جوہر کی نمود و نمائش، غرض اُن

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 103 (1,1)

کے مرنے جینے کے سب کاموں کا ٹھیکہ اُن کے پاس تھا۔"(72)

عام آدمیوں کے کاموں کا اِس طرح ٹھیکہ لینا اور عملی طور پر اس طرح خدمت کرنا، میراجی کی عظمت اور بڑے پن کی دلیل ہے۔عام آدمی سے اِتنا دوستانہ اور خدمت کا جذبہ رکھنے کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تُند مزاج بھی تھے۔ جتنے منکسر المزاج تھے اُتنے ہی انانیت کے قائل۔

بقول اخلاق احمد دہلوی:

"شاعر کا دل، محتسب کا دماغ اور فوجی چال ڈھال رکھنے کی وجہ سے وہ اکثر اوقات اپنے دوستوں کے سنبھالے نہ سنبھلتے۔ وہ بے قاعدگیوں تک میں باقاعدگی اور خاص نوع کے نظم وضبط کے قائل تھے۔۔۔۔۔ میلے لباس اور اپنے کُھلی پن کے باوجود مردِ معقول نظر آتے۔۔۔۔۔ بغیر صابن ہاتھ دھوئے کھانا نہ کھاتے اور کھانا کھا کر اپنے کپڑوں سے ہاتھ صاف کر لیتے۔"(73)

یہ اِس لیے تھا کہ اُن میں ظاہر داری یا ریاکاری نہیں تھی۔ اُن کا ظاہر باطن ایک تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ باطن روشن تر تھا اور وہ کسی قسم کے کمپلیکس کا شکار نہیں تھے۔

میراجی کی ایک اور بڑی انسانی صفت، جس کا خاکہ نگاروں نے خاص ذکر کیا ہے، وہ روپے پیسے کے لالچ، حرص و ہوس سے بے نیازی اور بے رغبتی ہے۔ اُنھوں نے زندگی بھر روپے پیسے کو اہمیت نہیں دی۔ روپیہ پیسہ ہاتھ آیا تو اُسے بے دردی سے اُڑا دیا، لُٹا دیا، غریبوں میں بانٹ دیا اور پھر اپنی فاقہ مستی میں خوش اور مطمئن۔ ممکن ہے اِس مادی عہد میں اِسے میراجی کی کم عقلی یا حماقت سے تعبیر کیا جائے مگر حقیقت میں یہ میراجی کی عالی ظرفی اور عظمت کی کہانی ہے۔

احمد بشیر صاحب لکھتے ہیں:

"میراجی کو کبھی دولت مند بننے کی آرزو نہیں ہوئی۔ اُسے تو روپے جیب میں رکھنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ روپیہ اُس کے لیے ایک غیر مانوس چیز تھی، جیسے سکّے اُس کی جیب میں جلنے لگتے ہوں۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کے تن بدن میں آگ نہ لگ جائے۔ اِس لیے وہ جلد از جلد جیب خالی کر دیتا تھا۔"(74)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 104 (1,1)

زندگی گزارنے کے لیے پیسہ ضروری بھی ہے۔ایک دفعہ میرا جی کو ضرورت پڑی تو بقول احمد بشیر:

''میرا جی نے حاجت سے مجبور ہو کر ایک فلم میں ڈاکیے کا پارٹ بھی کیا اور اُس کے معاوضے میں پچاس روپے بھی پائے، جن کی اُس نے شراب پی ڈالی۔وہ شراب نہ پیتا تو روپے کہیں پھینک کے آجاتا۔''(75)

میرا جی اپنی شخصیت کے حوالے سے دوسروں سے منفرد تھا اور زندگی کے ہر عمل میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھا،مگر یہ عمل محض اپنی انفرادیت کے دِکھاوے کے لیے نہیں تھا بلکہ اُس کی شخصیت کا حصہ تھا۔اخلاق احمد دہلوی صاحب نے میرا جی کی روپے پیسے سے بے رغبتی کے بارے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میرے علم میں ہے کہ اُن کے مجموعوں کے اُنھیں سات سات سو، آٹھ، آٹھ سو ملے لیکن دوسرے ہی دن میرا جی کو کوڑی کوڑی کا محتاج پایا۔ پینے پلانے کے بعد جو کچھ بچتا وہ چپڑاسیوں،بھنگیوں اور تانگے والوں میں بانٹ دیتے،اور پھر بھی اگر کچھ پیسے بچ رہتے تو اُنھیں سڑک پر اُچھال دیتے اور خالی ہاتھ گرتے پڑتے گھر جا کر سو جاتے۔''(76)

اخلاق احمد دہلوی صاحب نے میرا جی کی شخصیت کی اِس عادت اور فطرت کے اور قصّے بھی بیان کیے ہیں۔وہ کہتے ہیں، ایک بار اُنھیں شاہد احمد دہلوی صاحب سے اچھی خاصی رقم ملی۔ بقول میرا جی چھ ہزار چھ سو چھبیس روپے چھ آنے، چھ پائی۔ یہ کثیر رقم بھی اُنھوں نے بانٹ دی، اُچھال دی۔اور اخلاق احمد صاحب نے اُنھیں ایک سڑک پر بے ہوشی کے عالم میں پڑے دیکھا۔ گھر پہنچا کر جیبیں دیکھیں تو اُن میں صرف چار سو باقی تھے اور وہ شاید اِس لیے بچ گئے کہ سڑک پر اُچھالنے سے پہلے بے ہوش ہو گئے۔ایک تانگے والے نے اخلاق احمد صاحب کو بتلایا کہ:

''ایک دفعہ بابو جی (میرا جی) نے اِتنی سی دُور کے (یعنی تھوڑے سے فاصلے کے) مجھے سو روپے دیے تھے اور کہا تھا ''جا بچہ تیرا اکلیان ہو۔''(77)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 105 (1,1)

دوسروں کے کلیان کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ میرا جی کی انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کی ایک کہانی ڈاکٹر رشید امجد نے یوں بیان کی ہے:

''بمبئی میں میرا جی نے اپنے دوست نسیم الظفر سے کہا:'' میں نے 2170 روپے جمع کر لیے ہیں۔ مکالمے اور گیت کے پانچ ہزار ایک پروڈیوسر سے طے ہوئے ہیں۔ کل ایک ہزار پیشگی مل جائے گی۔ بس اب میں ایک مہینے کے لیے لاہور چلا جاؤں گا۔ اُس وقت وہاں ایک مشہور ترقی پسند شاعر بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے میرا جی کی بات سُن کر رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔'' اگر دو ہزار کہیں سے مل جائیں تو اپنی ایک بہن کو سینی ٹوریم میں داخل کرادوں، تب دق کا دوسرا سٹیج ہے، جان بچ سکتی ہے۔ لیکن دو ہزار کہاں سے لاؤں؟'' یہ کہ کر وہ رونے لگے۔ میرا جی نے کہا، دو ہزار کل تم مجھ سے لے لینا۔۔۔۔ چلو جہاں اِتنے دن لاہور سے دُور گزرے وہاں کچھ اور سہی۔ میں دو تین مہینے بعد لاہور چلا جاؤں گا۔''(78)

مگر پھر وہ کبھی ماں سے ملنے لاہور نہ آسکا۔ انسانوں کے جنگل میں نگری نگری بھٹکتا یہ مسافر گھر کا رستہ بُھول گیا اور بقول احمد بشیر صاحب:

''بغلوں میں ہاتھ دبائے، سر جھکائے، ان دیکھی، اَن سُنی پُر اسرار گھاٹیوں میں گھومتے گھومتے ایک دن وہ ایک سُونی پگڈنڈی پر گر کے مرگیا۔''(79)

منٹو اُن کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اچھا ہوا وہ جلدی مرگیا۔ اُس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔''(80)

اختر الایمان نے قیوم نظر کے نام ایک خط میں میرا جی کی زندگی کے آخری لمحات کو بیان کیا ہے۔ اُن کی بیماری، علاج اور میرا جی کے دورانِ علاج بھی انتہائی بد پرہیزی اور اپنی من مانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اختر الایمان کا کہنا ہے کہ:

''ہم نے اُنھیں بچانے کی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی لیکن افسوس کہ خود اُنھوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔''(81)

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 106 (1,1)

اِسی قسم کا ایک خط اختر الایمان کی بیوی سلطانہ منصوری نے مظہر ممتاز کو لکھا ہے اور اِس بات پر تعجّب کا اظہار کیا ہے کہ:

''پاکستان میں یہ افواہ کیسے پھیل رہی ہے کہ میراجی نے نہایت کسمپرسی کے عالم میں انتقال کیا، جب کہ ہم نے اُن کا ہر طرح خیال رکھا اور بمبئی کے سب سے بڑے ہسپتال کنگ ایڈورڈ میموریل ہسپتال میں اُن کے علاج کی کوشش کی مگر میراجی بلا کے بد پرہیز تھے۔ جس سے اُن کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی اور ہماری کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور آخر کار 3 نومبر 1949ء، شام کے چار بجے اُن کا انتقال ہوگیا۔''(82)

خط کافی طویل ہے جس میں اُنھوں نے اپنی تمام تر کوشش، علاج اور اُن کی بد پرہیزیوں کی تفصیل درج کی ہے۔ اِس لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ میراجی کا انتقال کسمپرسی کے عالم میں ہوا۔

بہر حال میراجی 3 نومبر کو اِس دُنیا سے رُخصت ہوئے اور 4 نومبر 1949ء کو اُنھیں میرن لائن قبرستان بمبئی میں دفن کر دیا گیا۔

لوگوں کی عصبیت اور نظریاتی اختلاف کے غبار میں انسانی قدروں کے اوجھل ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اختر الایمان نے یہ گِلہ ضرور کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تمھیں معلوم ہے میراجی کے جنازے میں بمبئی جیسے عظیم شہر میں کتنے لوگ شامل ہوئے تھے؟ صرف چار، میرے ہم زلف (سرن جی) مدھوسودن، پریم (شالیمار فلم کمپنی کے ملازم) اور میں۔''(83)

اِن چاروں نے مل کر سب انتظام کیا اور اُس بھٹکے ہوئے مسافر کو آخری منزل تک پہنچایا۔ اس شخص کی آخری منزل، جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی میراجی کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ درد و کرب کا ایک مجسّمہ تھے۔ اُنھیں زندگی کی کوئی بھی منزل راس نہیں آئی۔ وہ زندگی بھر تڑپتے اور تلملاتے رہے اور بالآخر اُنھوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔۔۔۔۔۔۔ میراجی مر گئے، بہت افسوس ہے۔ لیکن سب سے بڑا افسوس اِس بات کا ہے کہ میراجی کے ساتھ ایک دُنیا ختم ہوگئی۔ ایک مخصوص رُجحان ختم

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 107 (1,1)

ہوگیا۔ ایک انداز ختم ہوگیا۔ ایک اِدارہ ختم ہوگیا۔ ایک تحریک ختم ہوگئی۔" (84)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریر میں اُن کے غم، دُکھ، افسوس اور ہمدردی کے جذبات کی جھلک واضح اور نمایاں ہے مگر شوکت تھانوی صاحب کہتے ہیں، میراجی مرے کب ہیں؟ وہ رُجحان اور تحریک کب ختم ہوئی ہے۔ میراجی تو بھوت بن کر جیئے اور مرنے کے بعد مزید زندہ ہو رہے ہیں۔ میراجی جیسے لوگ نہیں مرتے مگر ایسے لوگ سمجھ میں بھی کم آتے ہیں۔

شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

"وہ شخص جو ثناء اللہ بن کر پیدا ہوا، اور میراجی بن کر مرا۔ وہ مسلمان جو ہندو میتھالوجی کا دیوانہ تھا، وہ شاعر جس کو مذہبیات، جنسیات اور نفسیات کے مطالعہ کا جنون تھا، وہ کنوارہ جو میرا سین پر مر کر زندہ رہا اور پھر دِلّی میں بادلی بیگم اور بِلّی خانم کے عشق کا دم بھرتا رہا مگر کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہوا۔ وہ شرابی جس کو خود شراب پیئے جا رہی تھی، وہ وجدانی تخلیہ میں قرآن پاک سُن کر روتا اور دمِ تحریر، بغیر دیوناگری میں "اوم" لکھے ہوئے، کچھ نہ لکھ سکتا، غور کیجئے، ایسا آدمی سمجھ میں کیوں کر آسکتا تھا؟ اس قسم کی شخصیتیں سمجھنے سمجھانے کے لیے ہوتی ہی کب ہیں؟ ان پر غور کیجیے تو عقل کا زیاں، غور نہ کیجیے تو ذہنی فالج کا خطرہ۔" (85)

شوکت تھانوی صاحب نے عقل کے زیاں کا تھوڑا بہت رِسک لیا ہے مگر ذہنی فالج سے محفوظ ہو گئے۔ ایسا ہی رِسک سحاب قزلباش نے بھی لیا ہے۔ وہ سحاب قزلباش جس نے زندگی بھر سیدھے مُنہ اُس سے بات تک نہ کی اور اُس بارے ایک لائن تک نہ لکھی کہ نہ جانے اُس کی اُلٹ کھوپڑی کیا سمجھ بیٹھے۔ مرنے کے بعد اُس کی تصویر سامنے رکھے اُس سے باتیں کرتے ہوئے اعتراف کر رہی ہے کہ اُس کی رُوح بڑی مقدّس اور معصوم تھی۔

"گندگی میں لتھڑے جسم میں مقدّس، معصوم، حسین اور پیاری روح۔" (86)

شاہد احمد دہلوی نے ایک جملے میں میراجی کی مکمل شخصیت کو بیان کر دیا ہے:

"اس غلیظ پیکر میں لطیف روح تھی۔" (87)

آہ، میراجی، غلیظ پیکر ۔۔۔۔۔۔۔ واہ میراجی لطیف

❁❁❁❁❁

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 108 (1,1)

حواشی

1۔ الطاف گوہر، پیش لفظ ''کلیاتِ میراجی''، مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، اُردو مرکز، لندن، 1988ء، ص26

2۔ قدرت اللہ شہاب، ''یوم میراجی'' کے موقع پر صدارتی خطبہ (تاریخ ندارد) مطبوعہ ''نقوش''، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، شمارہ 27، 28، نومبر دسمبر 1952ء، ص118

3۔ میراجی، ''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ ''میراجی، ایک مطالعہ'' مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990ء، ص469

4۔ ایضاً، ص467

5۔ ایضاً، ص469

6۔ سحاب قزلباش، ''میرا کوئی ماضی نہیں''، فضلی سنز، کراچی، 1995ء، ص16

7۔ میراجی، ''اکچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ، ص471

8۔ محمد اکرام اللہ کامی، ''میرا بھائی''، مشمولہ ''ادبی دُنیا''، لاہور، فروری 1950ء، ص102

9۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، 1995ء، ص28

10۔ محمد حسن عسکری، خاکہ ''میراجی''، مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ''، 1990ء، ص77

11۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، مکتبہ عالیہ، لاہور، 1979ء، ص34، 35

12۔ مظہر ممتاز، ''یہ میراجی ہیں''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ 14، ص26

13۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص29

14۔ مظہر ممتاز، ''یہ میراجی ہیں''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ 14، ص26

15۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''نظمِ جدید کی کروٹیں''، سنگت پبلشرز، لاہور، 2018ء، ص56

16۔ ایضاً، ص56، 57

17۔ ایضاً، ص57

18۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص104

19۔ ممتاز مفتی، ''پیاز کے چھلکے''، الفیصل، لاہور، 2000ء، ص135، 136

20۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص105

21۔ عصمت چغتائی، ''سوکھے پتے''، مشمولہ ''چراغ روشن ہیں''، مرتب عقیل جعفری، اٹلانٹس پبلی

کیشنز، کراچی، 2016ء، ص96
22۔ سحاب قزلباش، ’’میراجی‘‘، مشمولہ ’میرا کوئی ماضی نہیں‘، فضلی سنز، کراچی، 1995ء، ص21
23۔ عصمت چغتائی، ’’سوکھے پتے‘‘، مشمولہ ’چراغ روشن ہیں‘، ص102
24۔ ڈاکٹر رشید امجد، ’’میراجی، شخصیت اور فن‘‘، ص44
25۔ سحاب قزلباش، ’’میراجی‘‘، مشمولہ ’میرا کوئی ماضی نہیں‘، ص16
26۔ اخلاق احمد دہلوی، ’’پھر وہی بیاں اپنا‘‘، ص26
27۔ ڈاکٹر رشید امجد، ’’میراجی، شخصیت اور فن‘‘، ص45
28۔ تابش دہلوی، ’’دید باز دید‘‘، حیات اکیڈمی، کراچی، 1990ء، ص41
29۔ مختار صدیقی، ’’اکیلا‘‘، مشمولہ ’میراجی ایک مطالعہ‘، لاہور، ص187
30۔ مظہر ممتاز، ’’یہ میراجی ہیں‘‘، مشمولہ ’نقوش‘ لاہور، شمارہ 14، ص29،
ڈاکٹر رشید امجد، ’’میراجی، شخصیت اور فن‘‘، ص70
31۔ احمد بشیر، ’’جو ملے تھے راستے میں‘‘، گورا پبلشرز، لاہور، بار دوم، 1997ء، ص121
32۔ ایضاً، ص122
33۔ ایضاً، ص130
34۔ ایضاً، ص122
35۔ ایضاً، ص122
36۔ عصمت چغتائی، ’’سوکھے پتے رمیراجی‘‘، مشمولہ ’چراغ روشن ہیں‘، ص93
37۔ ایضاً، ص95
38۔ ایضاً، ص102
39۔ ایضاً، ص100
40۔ سحاب قزلباش، ’’میرا کوئی ماضی نہیں‘‘، ص22
41۔ ایضاً، ص23
42۔ ایضاً، ص31
43۔ ڈاکٹر رشید امجد، ’’میراجی، شخصیت اور فن‘‘، ص48
44۔ ایضاً، ص49

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 110 (1,1)

45۔ محمود نظامی، ’’میراجی‘‘ مشمولہ ’’نقوش شخصیات نمبر‘‘، جلد اول ص593
46۔ شاہد احمد دہلوی، ’’گنجینۂ گوہر‘‘، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء، ص147، 149
47۔ شوکت تھانوی، ’’میں میراجی کو نہیں جانتا‘‘، مشمولہ ’’نقوش‘‘ نمبر 15، 16، سالنامہ، لاہور، 1950ء، ص89
48۔ اخلاق احمد دہلوی، ’’پھر وہی بیاں اپنا‘‘، ص176
49۔ سعادت حسن منٹو، ’’گنجے فرشتے‘‘، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص59
50۔ مختار صدیقی، ’’اکیلا‘‘، مشمولہ ’’میراجی، ایک مطالعہ‘‘، ص180
51۔ ممتاز مفتی، ’’پیاز کے چھلکے‘‘، ص132
52۔ تابش دہلوی، ’’دید باز دید‘‘، ص140
53۔ سعادت حسن منٹو، ’’گنجے فرشتے‘‘، ص65
54۔ احمد بشیر، ’’جو ملے تھے راستے میں‘‘، ص107
55۔ قدرت اللہ شہاب، صدارتی خطبہ مشمولہ ’’نقوش‘‘ لاہور، شمارہ 27، 28، نومبر، دسمبر، 1952ء، ص119
56۔ شاہد احمد دہلوی، ’’گنجینۂ گوہر‘‘، ص152
57۔ ایضاً، ص152
58۔ احمد بشیر، ’’جو ملے تھے راستے میں‘‘، ص120
59۔ سعادت حسن منٹو، ’’گنجے فرشتے‘‘، ص64
60۔ ایضاً، ص64
61۔ ایضاً، ص65
62۔ شاہد احمد دہلوی، ’’گنجینۂ گوہر‘‘، ص147
63۔ اخلاق احمد دہلوی، ’’پھر وہی بیاں اپنا‘‘، ص176
64۔ سعادت حسن منٹو، ’’گنجے فرشتے‘‘، ص66
65۔ انتظار حسین، ’’علامتوں کا زوال‘‘، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص156
66۔ انتظار حسین، ’’علامتوں کا زوال‘‘، ص166
67۔ شاہد احمد دہلوی، ’’گنجینۂ گوہر‘‘، ص153

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 111 (1,1)

68۔ احمد بشیر،''جو ملے تھے راستے میں''،ص124

69۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی،''آوارگانِ عشق''، ادارہ، ادب وتنقید، لاہور، 1980ء، ص44

70۔ سعادت حسن منٹو،''گنجے فرشتے''، ص64

71۔ اخلاق احمد دہلوی،''پھر وہی بیاں اپنا''، ص28

72۔ مختار صدیقی،''اکیلا''، مشمولہ میراجی ایک مطالعہ''، ص181

73۔ اخلاق احمد دہلوی،''پھر وہی بیاں اپنا''، ص176

74۔ احمد بشیر،''جو ملے تھے راستے میں''، ص127

75۔ ایضاً، ص127

76۔ اخلاق احمد دہلوی،''پھر وہی بیاں اپنا''، ص31

77۔ ایضاً، ص30

78۔ ڈاکٹر رشید امجد،''میراجی شخصیت اور فن''، ص93

79۔ احمد بشیر،''جو ملے تھے راستے میں''، ص107

80۔ سعادت حسن منٹو،''گنجے فرشتے''، ص71

81۔ اختر الایمان،''میراجی کے آخری لمحے''، مشمولہ''نقوش''، لاہور، شمارہ 27، 28، نومبر، دسمبر، 1952ء، ص123

82۔ مظہر ممتاز،''یہ ہیں میراجی''، مشمولہ''نقوش''، شمارہ نمبر 14، لاہور، ص31

83۔ اختر الایمان،''میراجی کے آخری لمحے''، مشمولہ''نقوش''، لاہور، ص123

84۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی،''آوارگانِ عشق''، ص57

85۔ شوکت تھانوی،''میں میراجی کو نہیں جانتا''، مشمولہ''نقوش'' شمارہ نمبر 15، 16، سالنامہ، 1950ء، ص90

86۔ سحاب قزلباش،''میرا کوئی ماضی نہیں''، ص24

87۔ شاہد احمد دہلوی،''میراجی''، مشمولہ''میراجی شخصیت اور فن''، مرتب کمار پاشی، نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1981ء، ص19

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 112 (1,1)

معصوم بادہ نوش

(خاکوں کے پس منظر میں شخصی تجزیاتی مطالعہ)

شاعرِ رومان سید عبدالحمید عدمؔ 10۔اپریل، 1910ء کو لائل پور میں پیدا ہوئے۔

بقول عدمؔ صاحب:

''آبائی وطن تلونڈی موسیٰ خاں ضلع گوجرانوالہ ہے لیکن 1910ء میں والد صاحب کاروبار کے سلسلے میں عارضی طور پر لائل پور میں اقامت پذیر تھے اس لیے راقم الحروف کی تشریف آوری وہیں ہوئی۔''1

بعد میں اُن کے والد مستقل لاہور منتقل ہو گئے اور بقول عدمؔ صاحب:

''میں نے اپنی تعلیم لاہور ہی میں مکمل کی۔ میٹرک اِسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے کیا۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا کہ والدِ گرامی کا انتقال ہو گیا اور میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت کر لی۔''2

حمیرا ہاشمی بیان کرتے ہیں کہ:

''1926ء میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی ذمے داری عدمؔ کے کاندھوں پر آن پڑی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ ایف۔اے کے بعد 1929ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے۔''3

اِس سلسلے میں اکمل علیمی صاحب لکھتے ہیں:

''عدمؔ سونے کا چمچہ مُنہ میں لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ 1926ء میں والد کا انتقال ہوا تو تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھر کی مالی ذمہ داریاں ان کے کمزور کندھوں پر آ گئیں۔ ایک رشتے دار نے کچھ اور تعلیم اور سرکارِ ہند کی ملازمت حاصل

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 113 (1,1)

کرنے میں امداد کی۔ اُن کو اُمید تھی کہ وہ برسرِ روزگار ہو کر اُن کی بیٹی سے شادی کر لیں گے، جو اُنھوں نے کی۔"4

اکمل علیمی صاحب نے اُس رشتے دار کا نام ظاہر نہیں کیا۔ ممکن ہے اپنی بیٹی کے رشتے کی خاطر اُن کے ہونے والے سُسر نے کوئی مدد کی ہو۔ اُن کی ملازمت کے بارے میں شاد امرتسری کا کہنا ہے کہ:

"بی اے کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے اور ایس۔ اے۔ ایس (سبارڈی نیٹ اکاؤنٹس سروس) کے امتحان میں دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار پاس ہوئے اور پھر دفتری کام میں محو ہو گئے۔"5

شاد امرتسری صاحب نے تعلیم بی۔ اے بتائی ہے اور کہا ہے کہ بی۔ اے کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک بھرتی ہوئے۔ جب کہ عدم صاحب کا اپنا کہنا یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد ملازمت اختیار کر لی تھی۔ عدم صاحب کا کہنا ہے کہ:

"تعلیم سے فراغت (انٹرمیڈیٹ) کے بعد ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر اِسی محکمہ سے منسلک ہو گیا۔ 1941ء میں محکمے کا بلند ترین امتحان SAS (ایس۔ اے۔ ایس) اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ 1948ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے عقد ہو گیا اور اپریل 1966ء میں اسی عہدے سے پنشن پر رُخصتی ہوئی۔"6

حزیں کاشمیری صاحب نے عدمؔ صاحب کی جائے پیدائش تلونڈی موسیٰ خاں، سن پیدائش 1909ء، ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت آڈیٹر ملازمت کا آغاز 1928ء اور سن وفات 1967ء بتایا ہے۔7

حزیں کاشمیری صاحب نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں، اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ یہ تمام معلومات درست نہیں ہیں۔ اُن کی جائے پیدائش لائل پور، سن پیدائش 1910ء، ملازمت کا آغاز 1929ء اور سن انتقال 1981ء ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحوں میں حوالہ جات کے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 114 (1,1)

ذریعے اندراج کیا گیا ہے۔

عدمؔ صاحب نے ملازمت کا آغاز 1929ء میں کیا۔ اپنے لا اُبالی پن اور خود فراموشی کے باوجود، اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو بڑے احسن انداز میں نبھایا۔

اے حمید صاحب لکھتے ہیں:

''وہ ملٹری اکاؤنٹس میں بڑے ذمہ دار افسر تھے اور ساری عمر اُنھوں نے ڈیوٹی انتہائی ذمے داری اور دیانت داری سے نبھائی۔کئی بار ایسا ہوا کہ ساری رات محفلِ ناؤ نوش گرم رہی۔ ہم رات کو دو بجے عدمؔ صاحب کو اُن کے چھاؤنی والے گھر چھوڑ کر آئے،تصور میں یہ بات نہیں آتی تھی، یہ شخص دوسرے روز تین بجے سے پہلے سو کر اُٹھے گا لیکن یقین کریں، اِس بات کے عینی گواہ موجود ہیں کہ دوسرے روز عدم صاحب ٹھیک آٹھ بجے اپنے آفس میں بیٹھے صوفی حالت میں بڑی ذمہ داری سے کام کر رہے ہوتے۔''8

سید ضمیر جعفری صاحب اُن کی ملازمت کی ذمے داریوں کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''عدم صاحب گو سست الوجود تھے مگر بعض باتوں میں اُن کی مستعدی پر حیرت ہوتی ہے۔اُن میں ایک دفتر کی حاضری تھی۔ دفتر کے وقت گھر سے یوں نکل جاتے جیسے تیر کمان سے۔''9

عدم صاحب نے اپنی ذات سے یکسر مُنہ موڑ کر اگر کسی چیز سے مفاہمت کی تھی تو وہ ملازمت تھی۔ سید ضمیر جعفری صاحب مزید لکھتے ہیں:

''عدم صاحب جب تک کلرک رہے، اُن کے سپرنٹنڈنٹ، یونٹ اکاؤنٹنٹ اور افسرانِ بالا اُن سے عموماً خوش رہتے تھے کہ وہ بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ مگر بعض افسر خفا بھی رہتے تھے کہ عدم اِتنی اچھی انگریزی کیوں لکھتے ہیں۔''10

سید ضمیر جعفری صاحب نے عدم صاحب کو بطور کلرک بھی اور بطور افسر بھی نوکری کرتے

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 115 (1,1)

ہوئے دیکھا ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ:

''میں نے اُن کو افسری کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ڈسپلن کے بغیر کام کے معیار کو برقرار رکھنے کا سلیقہ اُن پر ختم تھا۔دفتر کے کلرک تلازمہ غزل کی طرح ہنسی خوشی، صبح سے شام تک کام میں جُتے رہتے تھے۔''11

افسر کبھی اُن سے آزُردہ ہوں تو ہوں مگر ماتحت ہمیشہ اُن سے خوش رہے۔ملازمت میں حافظ لدھیانوی صاحب نے اُن کے ساتھ کام کیا ہے وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''عدم زندگی میں جتنا خود فراموش تھا، دفتری زندگی میں اُتنا ہی باہوش اور حاضر دماغ تھا۔۔۔۔میں نے عدم جیسا طباع، ذہین، ذی علم افسر نہیں دیکھا۔عدم اِتنی خوب صورت انگریزی لکھتا تھا کہ پڑھنے والے اُس کی علمی استعداد، اُس کی قابلیت، اپنے کام میں مہارت اور اندازِ تحریر کے معترف ہو جاتے تھے۔اُس کی تحریروں میں روانی، موضوع پر اختصار اور جامعیت، اعجاز کا درجہ رکھتی تھی۔دفتر میں وہ اِس انہماک سے کام کرتا تھا جیسے شعر تخلیق کر رہا ہو۔اُس کی تحریر واقعی تخلیق کا شہ پارہ تھی۔''12

دفتری امور کے بارے وہ جتنے ذمہ دار ہوں مگر گھر اور گھریلو معاملات بارے اُن کا رویہ ہمیشہ غیر ذمہ دارانہ رہا۔سید ضمیر جعفری صاحب لکھتے ہیں:

''گھر کا کارخانہ چلانے کے واسطے نون، تیل، لکڑی کے کھڑاگ سے اُن کو وحشت تھی۔۔۔۔۔۔امورِ خانہ داری سے اُن کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔بعض اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ عدمؔ صاحب کسی دوسرے گھر میں رہ رہے ہیں۔''13

گھریلو زندگی بارے اُن کا روّیہ ایسا ہی رہا۔یہ ذمہ داری نبھانے اور یہ بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانے کا اُنھوں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔اُن کے گھریلو حالات بارے صادق نسیم صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''عدمؔ صاحب، جب پنڈی رہتے تھے تو ہمارے گھر سے دو فرلانگ پر دسہرہ گراؤنڈ میں مکان تھا۔اِس قربت کی وجہ سے مجھے اُن کے گھر کے حالات اور

گزر اوقات کا پتہ چلا۔تنخواہ کا بمشکل دسواں حصّہ گھر دیتے۔اکثر فاقوں کا عالم رہتا۔ایک دن گھر میں فاقے کا عالم تھا۔پڑوسیوں نے ترس کھا کر ایک سیر آٹا بھیج دیا۔۔۔۔۔۔ محکمے والوں کو پتہ چلا تو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو آدھی تنخواہ بیگم عدم کو گھر بھجوا دیتے۔‘‘14

گھر میں فاقوں کا راج رہا اور عدم صاحب اپنی فاقہ مستی میں اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔ کشور ناہید تحریر کرتی ہیں:

’’پہلی تاریخ کو جب تنخواہ ملتی تو اِرد گرد مخمور دوستوں کا گروہ سامنے ہوتا تھا۔وہ تنخواہ اُن میں تقسیم کر کے،دفتر سے قرض لے کر گھر جایا کرتے تھے۔‘‘15

یہ تنخواہ کیسے تقسیم ہوتی تھی،اِس کا ذکر حافظ لدھیانوی صاحب ایسے کرتے ہیں:

’’عدم ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شاہ خرچ ہوتا تھا۔دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتا۔اُسے آنے والے کل کی پروا نہ تھی۔پہلی تاریخ سے شراب کے دَور چلنا شروع ہو جاتے۔راتیں شراب خانے کی نذر ہو جاتیں۔احباب کی محفلیں منعقد ہوتیں۔چار پانچ دن اِن ہی ہنگاموں میں گزر جاتے۔پانچ چھ روز بعد اُس کی جیب خالی ہوتی۔‘‘16

عدم صاحب تو ادھر دوستوں کے ساتھ ناؤ نوش میں مصروف کُھلے دل سے پیسے خرچ کر رہے ہیں اور گھر کیسے چل رہا ہے؟ اِس بارے تمام خاکہ نگاروں نے اُن کی اہلیہ محترمہ کی تعریف کی ہے۔خلش ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

’’عدم صاحب کی بیگم صاحبہ یقیناً ایک عظیم خاتون تھیں۔اُنھوں نے اپنی پوری زندگی کرب و اذیت کے لمحوں میں رہ کر اُن کے ساتھ بسر کی۔عدم صاحب نے کبھی بھی عیال داری کے فریضے کی طرف توجّہ نہ دی۔تنخواہ ملتی تھی تو ان پیسوں کی شراب پی لیتے تھے۔میں حیران ہوں کہ وہ عظیم خاتون گھر گرہستی کا بوجھ اُٹھا کر طویل عرصے تک کیوں کر زندہ رہیں۔‘‘17

وہ نہ صرف زندہ رہیں بلکہ گھر کو بھی بہت خوش اسلوبی سے سنبھالا اور بچوں کی بھی عمدہ تربیت کی اور اُنھیں اعلیٰ تعلیم بھی دِلوائی۔حافظ لدھیانوی رقم طراز ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 117 (1,1)

''عدمؔ صاحب کی رفیقۂ حیات سلیقہ مند، سمجھ دار اور ذمہ دار خاتون تھیں۔ عدم کے لا اُبالی پن اور غیر ذمہ دارانہ زندگی کے باوصف اُس نے بچوں کی عمدہ تربیت کی اور اُنھیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔''18

اے حمید صاحب، اسے عدمؔ پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم سمجھتے ہیں کہ:

''اللہ نے اُنھیں نہایت وفا شعار، دوراندیش اور صابر بیوی اور ہونہار اولاد عطا کر دی تھی۔ بیگم صاحبہ نے جس بُردباری، تحمل اور صبر و شکر اور دانش مندی کے ساتھ عدم صاحب کا ساتھ نبھایا اور اولاد کی پرورش کی یہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُنھیں لائق بنایا اور وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور چھاؤنی میں اپنی عالی شان کوٹھی بنوائی۔''19

اسرار زیدی صاحب، بیگم عدم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اِس امر کا پوری طرح علم ہے کہ یہ عدمؔ کی بیوی ہی تھیں جو کم و بیش نصف صدی تک عدمؔ جیسے آدمی سے نباہ کر سکیں۔ گھر کی ذمہ داری، اولاد کی پرورش، حتیٰ کہ خود عدم کی دیکھ بھال جس طرح اُنھوں نے کی، وہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ عدم صاحب قریب قریب ہر روز مدہوشی کے عالم میں نصف شب کے بعد گھر پہنچتے بلکہ پہنچائے جاتے اور یہ اُن کی مرحومہ بیگم تھیں جو اس کیفیت میں نہ صرف یہ کہ اُن کی مناسب دیکھ بھال کرتیں بلکہ اس کے بعد عدمؔ کی غذا اور لباس کا بھی پوری طرح خیال رکھتی تھیں۔''20

اِتنی وفا شعار، سلیقہ مند، گھر اور بچوں کو سنبھالنے، عدم صاحب کا خیال رکھنے والی اور خدمت گزار بیوی کے ہوتے ہوئے بھی عدم صاحب نے ایک اور شادی کر لی۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے اپنے بچپن میں، پونا میں، عدم صاحب کی اُس نئی بیوی کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اُسے بازار سے سودا سلف بھی لا کر دیتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس بیوی کی بدمزاجی کے قصّے بھی بیان کیے ہیں۔ عدم صاحب نے خود بھی خلش ہمدانی صاحب کے استفسار پر اس شادی کی کہانی اور بیوی کے مزاج کے بارے تفصیل سے بتایا ہے۔ عدمؔ صاحب بیان کرتے ہیں:

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 118 (1,1)

’’ملکی میری عراقی بیوی تھی۔ اُس کا پورا نام ملکیہ تھا۔ میں دوسری جنگِ عظیم میں عراق گیا تھا۔ شام کو روزانہ ایک کیفے میں جایا کرتا تھا۔ وہاں ملکی کو اکثر دیکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسے اپنی جانب ملتفت پایا اور پھر یہ ملاقاتیں شادی پر منتج ہوئیں۔ یہ شادی ملکی کی پسند پر ہوئی۔۔۔۔۔ ملکی کوئی اِتنی خوب صورت نہ تھی، بس واجبی سی شکل وصورت کی عورت تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر گالی گلوچ پر اُتر آتی۔ جب میں عراق سے اُس کے ساتھ واپس انڈیا آیا اور میرا پوسٹنگ پونا ہوا تو محکمہ کے آدمیوں کی بیویوں نے اُسے میری پہلی شادی اور بچوں کا بتایا تو اُس کا ردِّ عمل بڑا سخت ہوا۔ مسلسل کئی دِنوں تک مجھ سے لڑتی رہی۔ نہ مجھے کھانا دیتی تھی اور نہ ہی ازدواجی حقوق کی ادائیگی کرتی تھی۔ ایک دن غصّے میں آ کر مجھ سے کہنے لگی:

’’سالا تمھارے پیچھے ہم نے اپنا بے بی کو بھی چھوڑا۔ تم سالا بڑا حرامی آدمی ہے۔ ہم کو ایک دم چکر دیا ہے۔ ہم تمھارے ساتھ اب کیسے رہ سکتا ہے۔ سالا، تم ایک دم سکاؤنڈرل (SCOUNDREL) ہے۔‘‘ میں نے اُس کی منت سماجت کی اور اُسے راضی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔ وہ ہنس پڑی ہنس پڑی اور اُٹھ کر میری جھولی میں بیٹھ گئی۔ پہلے کہتی تھی ’’سالا، تم ایک دم اوّل نمبر کا جھوٹا ہے‘‘ اب کہنے لگی:

سالا، تم اچھا آدمی ہے۔ ایک دم ڈرنک بند کرو۔‘‘ 21

عدم صاحب نے ملکی کی بدمزاجی کے حوالے سے ایک اہم واقعہ یوں بیان کیا ہے:

’’ایک دفعہ میں پی کر رات دیر سے لوٹا۔ پہلے تو دروازہ نہ کھولتی تھی۔ بالکنی میں کھڑی مجھے بڑی بڑی گالیاں دیتی رہی۔ آخر کار گلی کی عورتوں نے آ کر سمجھایا بجھایا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ جونہی میں لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر سیڑھیوں کے دروازے میں پہنچا، مجھے اِتنے زور کا دھکا دیا کہ میں سیڑھیوں میں گرا اور پھر لوٹ پوٹ ہوتا ہوا نیچے سڑک پر آ رہا۔ اِتنا زور سے گرا کہ بے ہوش ہو گیا۔ دفتر کے ساتھی اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر کی مسلسل کوششوں سے کوئی دو گھنٹے بعد ہوش

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 119 (1,1)

آیا۔ وہ مجھے ہسپتال دیکھنے بھی نہیں آئی۔ بڑی بدمزاج اور اکھڑ عورت تھی۔‘‘22

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب، عدمؔ کی دوسری شادی اور ملکیہ کے بارے یوں قصہ بیان کرتے ہیں:

’’عدمؔ صاحب جن دِنوں عراق میں تھے تو اُن کا ایک عراقی کُنبہ میں آنا جانا ہوگیا، جہاں عدم صاحب ایک خاتون کے ساتھ اٹک گئے۔ یہ ملکیہ تھی، جسے واپسی پر اپنے ساتھ ہی لیتے آئے۔ یہ بیوہ تھی اور بغداد میں ایک بچہ چھوڑ کر اُن کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور شاید چیچک کے داغ بھی تھے۔ فراک پہنتی تھی اور اُس زمانہ کا مشہور سگریٹ ’پاسنگ شو‘ پیتی تھی۔ ملکیہ کھانے پکانے کے جھنجھٹ سے زیادہ تر آزاد تھی اور میں (ڈاکٹر صاحب اپنے بچپن میں) دوپہر کا کھانا ایک ایرانی ریسٹورنٹ سے لا کر دیا کرتا تھا۔‘‘23

ڈاکٹر صاحب مزید بیان کرتے ہیں:

’’عدمؔ صاحب پی پلا کر رات کو دیر سے گھر آتے تو ملکیہ کی غصیلی آواز میموں جیسی غلط اُردو آدھی رات کو ساری چال میں گونجتی .... مگر عدم نے دیر سے گھر آ کر کبھی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ اوّل تو جلی بُھنی ملکیہ دروازہ ہی نہ کھولتی تھی جب کہ شرابی کے ذہن والی یکسوئی کے ساتھ یہ صابر و شاکر زنجیر ہلاتے رہتے تھے۔ اس کے بعد جب دروازہ کُھل جاتا تو طوفان بن کر اُن کا استقبال کرتی۔ یہ تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔ بعض اوقات وہ غصہ میں آ کر کوئی چیز دے مارتی۔ ایک مرتبہ دھکا دیا تو سیڑھیوں سے لُڑھکتے ہوئے دھم سے نیچے آ پڑے۔

ایک رات اُس نے اُن پر سلائی مشین اُٹھا پھینکی تھی۔ چنانچہ مشین اور عدمؔ نے اکٹھے سیڑھیاں طے کیں جس کے نتیجے میں دونوں میں ’چِب‘‘ پڑ گئے۔ اس نوع کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔‘‘24

گو ڈاکٹر صاحب کا وہ بچپن کا زمانہ تھا مگر وہ ان حالات اور واقعات کے عینی گواہ ہیں۔ اُنھوں نے یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 120 (1,1)

عدمؔ صاحب ملکیہ کی واپس عراق روانگی اور پہلی بیوی کے اِس شادی پر ردِّ عمل اور رویّے بارے خود بیان کرتے ہیں:

’’پونا سے میرا پوسٹنگ انبالہ چھاؤنی میں ہوگیا۔ میں ملکی کو لے کر انبالہ آ گیا۔ اور پھر اچانک ایک دن گھر والے بھی انبالہ پہنچ گئے۔ میں نے ملکی کے لیے ایک دوسرے گھر کا انتظام کر دیا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا مگر ملکی کو باقاعدگی سے خرچہ دیتا رہا۔ دن میں کچھ وقت اُس کے ساتھ گزارتا، راتیں پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزارتا چونکہ واپسی پر مجھے کسی ہنگامہ آرائی کا کوئی خدشہ نہ تھا جب کہ ایسی حالت میں اگر ملکی کے ہاں جاتا تو وہ ایک طوفان برپا کر دیتی۔‘‘

اپنی پہلی بیوی کی وفا شعاری اور شرافت کی تعریف کرتے ہوئے عدم صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

’’جب وہ بچوں کو لے کر پنڈی سے انبالے پہنچی اور اُس نے گھر میں ایک جواں سال غیر ملکی خاتون دیکھی، یقیناً دل میں بے حد رنجیدہ خاطر ہوئی ہوگی مگر مُنہ سے اُس خدا کی بندی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُس کی خاموشی اور موقعہ کی نزاکت کے مطابق صبر وشکر خاموش اظہار تھا۔ اور میں شرم کے مارے بیوی بچوں سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ شاید میری بیوی نے بچوں کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی بچہ بھی میرے سامنے اِس موضوع پر بات نہ کرے۔ میں ایک بھاری بوجھ اُٹھائے پھرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری پہلی بیوی میری باز پُرس کرے، میرے ساتھ لڑے جھگڑے اور میں بھی اِس طرح اپنے دل کا غبار نکالوں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی نہ بولا اور میری ضمیر مجھے برابر کچوکے لگاتی رہی۔ میرے بیوی بچوں کے آنے سے ملکی کا زور ٹوٹ گیا۔ اب میں جاتا تو وہ مجھ سے بڑی ہی مختصر بات کرتی۔ جس طرح میری بیوی کے صبر نے مجھ پر ایک اثر مرتب کیا تھا، میں سمجھتا ہوں یہی کیفیت ملکی کی بھی تھی۔ وہ بھی اِس بوجھ کو اُتار پھینکنا چاہتی تھی لیکن میری بیوی نے ایسا کوئی موقع فراہم نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد میں دو دن ملکی کے پاس نہ جا سکا۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر سیدھا اُس کے کوارٹر کی طرف گیا۔ خلافِ معمول اُس گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ساتھ والوں

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 121 (1,1)

سے پوچھا۔ایک نے مجھے بتایا’’آج دو دِن ہوئے ملکی واپس عراق چلی گئی ہے۔
چابی میری بیوی کو دے گئی ہے کہ آدم صاحب (عدم صاحب) آئیں تو اُنھیں دے دینا
اور اُن کو بتا دینا کہ آپ کا سامان جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔اب میں یہاں نہیں رہ
سکتی۔خدا آپ کو خیریت سے رکھے۔خدا حافظ۔‘‘25

یوں ملکی، عدم صاحب کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل کر عراق واپس چلی گئی۔اِس طویل کہانی میں پہلی بیوی کی وفا، شرافت اور صبر و شکر کی بھی مکمل تفصیل موجود ہے۔ملکی تو واپس چلی گئی مگر جہلم کی بدنامِ زمانہ اور بازاری خاتون شاہدہ ابھی موجود ہے۔شاہدہ بارے عدم صاحب کا بیان ہے کہ:

’’شاہدہ مجھے اِس لیے اچھی لگتی ہے کہ یہ ملکی کی ٹرو کاپی (TRUE COPY) ہے۔شاہدہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے ملکی یاد آجاتی ہے۔اُسی شکل وصورت اور اُسی ٹمپرامنٹ (TAMPERAMENT) کی وہ بھی تھی۔اِسی لیے تو یہ مجھے پیاری لگتی ہے۔۔۔حالانکہ عورتوں سے ملنے جُلنے میں سیکس کا کوئی عمل دخل نہیں۔۔۔۔۔۔اب اِس طرف رغبت ہی نہیں ہوتی۔‘‘26

شاہدہ بھی اپنے ہی جیسی اپنی دو ساتھی عورتوں کے ہمراہ خلش ہمدانی صاحب کو بتاتی ہے کہ:

’’شاہ صاحب (عدم صاحب) بڑے بھلے مانس ہیں۔وہ عورتوں کی بے حُرمتی نہیں کرتے۔وہ عورت سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ زلفیں بکھرا کر اُنھیں شراب پلائے۔اِس سے زیادہ کچھ نہیں .... وہ عورتوں کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے۔شراب کو عورت پر ترجیح دیتے ہیں۔‘‘27

شاد امرتسری کہتے ہیں، عدم صاحب نے کبھی عشق نہیں کیا اور عشق نہ کرنے کا سبب اُن کی فطری بے راہ روی اور اُن کا طبعی لا اُبالی پن ہے۔اُن کا کہنا ہے:

’’عدم صاحب نے کبھی کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق و پجاری ہیں اور یہ احساس اکثر ہنگامی ہوتا ہے۔‘‘28

اِس ہنگامی احساس کی عمدہ مثال جہلم کی شاہدہ سے تعلق اور لا تعلقی ہے۔

D 3/11/2025 5:05 PM PAGE 122 (1,1)

اے حمید صاحب نے طوائفوں سے تعلق کے پس منظر میں، عدم صاحب کے ایسے ہی مزاج کو دیکھا اور بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

عدم صاحب شاہی محلے بھی اکثر جاتے تھے مگر ''وہ کوئی تماش بین یا طوائفوں سے عشق کرنے والے رند شاہد باز نہیں تھے۔ یہ بات اُن کے مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ وہ شاہی محلّے طوائفوں کی زبان سے اپنی غزل سُننے جاتے تھے۔ اُنھیں صرف اتنا ہی شوق تھا کہ طوائف اُن کے سامنے بیٹھی اُن کی کوئی غزل گا رہی ہو، شاہی محلّے کے کوٹھوں پر بھی عدم صاحب کا کلام بے حد مقبول تھا اور گانے والیاں عدم صاحب کی گرویدہ تھیں اور اُن کا بے حد احترام کرتی تھیں۔'' 29

اِن تمام بداعمالیوں اور گھرداری سے بے رغبتی کے باوجود اُنھیں اپنے اہل وعیال سے محبت تھی اور اس محبت کی شدت و رِقّت کا اندازہ بقول سید ضمیر جعفری اِس بات سے ہوسکتا ہے کہ:

''حجام سے اپنے سامنے گھوڑے (بڑا بیٹا) کی نعل بندی یعنی اُس کے ناخن نہیں ترشواسکتے تھے۔۔۔۔۔ وہ اپنے گھر کو مسرور، پُراطمینان اور فراغت سے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے مگر بس ایسے ہی جیسے اُن کے شعر آپ ہی آپ پھلتے رہتے ہیں۔''30

اور پھر رفیقۂ حیات کی موت پر عدم صاحب کی حالت، دکھ اور غم کا پتہ چلتا ہے۔ بیوی کی موت نے تو عدمؔ سے وہ سب کچھ چھین لیا جو اُن کا طُرّہ امتیاز تھا۔ تن بدن کا ہوش تو اُنھیں پہلے بھی نہ تھا مگر بیوی کے جانے کے بعد تو یہ کیفیت مستقل طور پر مسلط ہوگئی۔

اسرار زیدی صاحب کو، ایک انٹرویو کے دوران اپنی حالت اور کیفیت کو عدمؔ صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''میری بیوی میرے لیے بہت کچھ تھیں۔ وہ ایک مکمل رفیقۂ حیات تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی صحیح بنیاد پر پرورش اور تعلیم وتربیت اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے بغیر میں اپنی تخلیقی زندگی کا تصوّر بھی نہ کرسکتا تھا۔ اگر وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتیں تو میرے لیے سکون کا ایک لمحہ

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 123 (1,1)

بھی ممکن نہ تھا۔۔۔۔ بیوی کے انتقال نے میری تمام صلاحیتیں سلب کرلی ہیں اور اعصاب کو اِس شدّت کے ساتھ متأثر کیا ہے کہ میں اِس موضوع پر کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔''31

زندگی کے تقاضے خواہ کچھ بھی تھے، عدم صاحب نے اپنی زندگی، اپنے ڈھب، اپنے رنگ، اپنے تقاضوں اور اپنی ضرورتوں کے مطابق بسر کی۔ شاعری، شراب، دوست اور دفتر، یہی اُن کی زندگی اور کُل کائنات تھی۔ فارغ بخاری اُن کی شخصیت بارے لکھتے ہیں:

''عدم اپنی عام زندگی میں بڑا بونگا شخص تھا۔ شاعر سے زیادہ اُس پر کسی کارخانے کے مزدور کا گماں ہوتا۔ نہ اچھا پہننے کی فکر، نہ اچھا کھانے کا شوق، نہ صحت و صفائی کا خیال، کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتا۔ غسل کرنا تو کجا، ہاتھ مُنہ دھونے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دانت تو اُس نے زندگی بھر کبھی صاف نہیں کیے۔ بالوں کو کنگھی کرنا بھی وقت کا ضیاع سمجھتا۔''32

شاد امرتسری سے عدم کی پہلی ملاقات 1945ء میں ہوئی۔ اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے عدم کے حُلیے، لباس اور جسمانی حالت کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، توند کچھ بڑھی ہوئی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے خو اُس کے جسم پر اٹک گئے ہوں، بوسیدہ کوٹ کے بٹن غائب، پاجامہ نما ڈھلکی ہوئی پتلون، گردن پر جمی ہوئی میل کی تہہ سے معلوم ہوتا تھا یہ شخص کئی دن سے نہیں نہایا۔''33

وہ مزید لکھتے ہیں:

''وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے اور پھر لطف یہ کہ اُنھیں اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رکھتے۔ کوٹ اور پتلون کی تہہ اکثر خراب ہوتی۔ کپڑے اُن کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک مُنہ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اُٹھے، کُلّی کی اور دفتر چلے گئے۔''34

عدم اِن تمام چیزوں سے بے نیاز تھا۔ اُس کے لیے زندگی سرمستی و سرخوشی کی ایک

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 124 (1,1)

لہر تھی۔بقول حافظ لدھیانوی:

''عدم نے زندگی کے تمام تفکرات کو، تمام پریشانیوں کو، تمام اُلجھنوں کو غرقِ مےناب کر رکھا تھا۔''35

قمر یورش نے عدمؔ کی حسین و جمیل غزلیں پڑھ کر اپنے ذہن میں اُن کا ایک ایسا خاکہ ترتیب دے رکھا تھا جس کے مطابق وہ دھان پان، پستہ قد، گورے چٹّے نوجوان، لکھنوی انداز کے شاعر تھے مگر جب پہلی ملاقات ہوئی تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔بقول اُن کے:

''عدم مجھے شاعرِ رومان کی بجائے، اچھے خاصے باڈی بلڈر، مکّے بازیا ناسخ کی طرح پہلوان نظر آ رہے تھے۔سانولا رنگ، دیو قامت، مَیں اُنھیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔وہ مجھے ہرگز شاعر نظر نہ آتے تھے۔وہ مجھے رستمِ زماں گاماں پہلوان کے شاگرد نظر آتے تھے مگر اُن کا گول چہرہ بچوں کی طرح معصوم تھا۔ہونٹوں پر بڑی دل کش مسکراہٹ۔''36

تنومند اور فربہ جسم کے سبب قمر یورش صاحب کو عدمؔ رستمِ زماں کے شاگرد اور ناسخ جیسے پہلوان نظر آئے مگر اِس فربہ جسم میں بقول سید ضمیر جعفری:

''عدم دوہرے جُثّے کے تنومند شخص ہیں لیکن اِس تن و توش میں فروتنی ہی فروتنی بھری ہوئی ہے۔''37

بعد کی ملاقاتوں کے بعد قمر یورش صاحب بھی برملا تسلیم کرتے ہیں:

''خوب صورت شاعر، بے حد دوست نواز، وہ دوستوں پر دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے والے، جتنے بڑے شاعر، اُتنے ہی بڑے انسان۔عدمؔ صاحب تو عجز و انکسار کا مجسّمہ تھے۔بات بات پر ہاتھ جوڑتے، اُنھیں اپنی بڑائی کا کوئی غرور نہ تھا۔38

عجز و انکساری کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو سادگی اور معصومیت ہے۔زندگی کے ہر پہلو میں اُن کی شخصیت کی یہ خوبی نظر آتی ہے۔شاد امرتسری تو عدمؔ صاحب کے مزاج کو بالکل بچوں جیسا مزاج سمجھتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 125 (1,1)

''عدم صاحب بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ وہ ریاکاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے ناآشنا ہیں۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں، دے نہیں سکتے۔''39

اِس عجز، انکساری، سادگی اور معصومیت کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی کی روشِ خاص دوستی اور دوست داری کے جذبوں سے ظہور پذیر ہوئی۔ ضمیر جعفری صاحب بیان کرتے ہیں کہ:

''سماجی زندگی کے ہر دائرے میں اس کا ساریشم کی طرح نرم وملائم شخص خال خال دیکھنے میں آتا ہے۔ عدم صاحب گلی محلّے میں کھیلتے ننھے مُنّے بچوں کو بھی حضور اور جناب کہہ کر بلاتے تھے۔ محبت ومروّت، امن وآشتی اور خلق وانکسار کا دوسرا نام عدمؔ ہے۔''40

فارغ بخاری صاحب کا عدم صاحب سے خلوت وجلوت میں ساتھ رہا ہے۔ مشاعروں کے علاوہ نجی محفلوں میں بھی، ناؤنوش کی صحبتوں میں بھی، ہوش کی حالت میں بھی اور مدہوشی کے عالم میں بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ہر عالم میں اُسے ایک نہایت معصوم انسان پایا۔ وہ بلانوش ضرور تھا، مٹکے سے بھی سیر ہونے والا نہیں تھا۔ اِس کے باوجود اُسے دوسرے شرابیوں کی طرح قے کرتے بہک کر اول فول بکتے کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ غیر معمولی ظرف کا انسان تھا۔ جتنی پیتا جاتا اُتنی ہوش مندی کی باتیں کرنے لگتا۔ اُسے تو آتش سیال نے جلا کر کُندن بنا دیا تھا۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ ایسے عالم میں اُسے کیڑے مکوڑے بھی سانس لینے والی اہم مخلوق نظر آتی اور وہ اُن سے مخاطب ہو کر کہتا: ''حضور! میں تو آپ کا خادم ہوں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو معاف کر دیجیئے۔ حضور! میں آپ کو ناراض نہیں دیکھ سکتا۔ 41

عدم نے اپنے آپ کو آتش سیال میں ڈال کر کس طرح کُندن بنانے کی کوشش کی ہے اور وہ اِس میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں، شاد امرتسری بتاتے ہیں:

''شراب کی ایک بُری عادت نے اُن کی تمام انسانی بُرائیوں کو ختم

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 126 (1,1)

کر دیا۔اس مستی اور رِندی نے اُن کو معصوم بنا دیا۔خلوص کا پیکر۔دوستوں سے ملتے، دل آزاری کا ڈھنگ ہی اُنھیں نہیں آتا۔کسی کو دکھ دینا اُن کی سرشت ہی میں نہیں۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک ہے۔کسی سے بغض یا عناد رکھنا اُن کی فطرت میں داخل ہی نہیں۔دل میں کبھی مَیل نہ رکھتے اور مَیل رکھنے والوں سے ملتے بھی نہیں تھے۔ شراب نے اُن کو واقعی انسان بنا دیا۔‘‘42

شاد امرتسری کا کہنا ہے کہ شراب نے اُن کی تمام انسانی برائیوں کو ختم کر کے اُنھیں واقعی انسان بنا دیا۔اِس بات کی مزید وضاحت اے حمید صاحب اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر یوں کرتے ہیں:

’’شراب بُرے آدمی کو مزید بُرا اور شریف آدمی یعنی رحم دل آدمی کو زیادہ رحم دل بنا دیتی ہے۔عدم صاحب کے پاس شراب بھی بڑی شریف زادی بن کر آتی اور عدمؔ صاحب زیادہ معصوم اور بھولے بھالے ہو جاتے۔طبعاً عدمؔ صاحب بڑے بھولے اور معصوم تھے۔‘‘43

عدم صاحب کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ لدھیانوی صاحب بتاتے ہیں کہ دفتر کے بعد وہ کبھی گھر کا رخ نہ کرتے بلکہ کسی دوست، کسی ہم مشرب کے گھر پہنچ کر محفلِ شب کا اہتمام کرتے۔ان محفلوں کی تفصیل اے حمید صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

’’عدم صاحب بے حد شاہ خرچ تھے۔اُن کا ہاتھ اور دل بڑا کھُلا تھا۔مَیں اِس کا شاہد ہوں کہ وہ جب محفل سجاتے تو جیب سے سارے پیسے نکال کر میز پر اپنے سامنے رکھ دیتے اور پھر وہیں سے اُٹھا اُٹھا کر خرچ کرتے رہتے۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی جیب سے پیتے تھے اور دوسروں کو پلاتے تھے۔‘‘44

ایک ایسی ہی محفلِ شب کا ذکر کرتے ہوئے حافظ لدھیانوی صاحب لکھتے ہیں:

’’عدمؔ نے ایک شب اُس دَور کے ممتاز شعراء کو شراب پلائی۔یہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔رات بھر جشن رہا۔شاعری کے دَور چلے۔جب سب شراب کے نشے میں مدہوش ہو گئے تو اس کے شاعر دوست اس کی جیب سے ساری رقم نکال

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 127 (1,1)

کر فرار ہو گئے۔ جب عدمؔ کو ہوش آیا تو اُس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔
دوسرے روز عدمؔ نے دفتر آ کر یہ ماجرۂ شب بیان کیا۔ بڑی سادگی سے ہنستے ہوئے
کہا: ''حافظ! دیکھو کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ میں نے دوستوں کی خاطر مدارات کی مگر وہ
میری جیب پر ہاتھ صاف کر کے چلے گئے۔''45

لوگ عدمؔ صاحب کو دھوکہ دے جاتے تھے مگر اُنھوں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ لغزشوں، خامیوں، کوتاہیوں کے باوجود احباب سے انتہائی خلوص کا برتاؤ کرتے۔ دوست اُن کا قیمتی اثاثہ تھے۔ وہ دوستوں سے فریب کاری کو گناہ سمجھتے تھے۔ زندگی بھر کسی بھی موقع پر اُنھوں نے دوستوں سے بے وفائی یا بے مروّتی کا اظہار نہیں کیا۔ بقول حافظ لدھیانوی صاحب:

''دوستوں کے سلسلے میں اُس کا قلب صاف شفاف آئینے کی طرح تھا۔
اگر عدمؔ کو گمان بھی گزرتا کہ اُس کا فلاں دوست اُس سے ناراض ہے تو وہ بلاتکلّف
معافی مانگتا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا کرتا ''حضور! میں آپ کا غلام ہوں۔''46

عدمؔ صاحب سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ وہ ہر آدمی پر بھروسہ کر لیتے۔ اُن کے بعض ملنے والے اُن سے جھوٹ بولتے مگر وہ اُن پر یقین کر لیتے۔ اگر کبھی کسی نے اُن سے کوئی زیادتی بھی کی تو وہ اُسے دل میں جگہ نہ دیتے بلکہ معاف کر دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے:

'انسان کی عظمت دوسروں کی خطائیں معاف کرنے میں ہے۔ دل
میں باتیں رکھنا تو گھٹیا لوگوں کا کام ہے۔''47

عدمؔ صاحب واقعی بڑے شاعر بھی تھے اور بڑے انسان بھی۔

عدمؔ صاحب نے سکول کے زمانہ ہی میں شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب عدمؔ صاحب کے حوالے سے ہی اُن کی شعر گوئی کے آغاز کے بارے بتاتے ہیں:

''اُن کے ایک عزیز دوست کا انتقال ہو گیا۔ جس کا غالباً عبدالحمید ہی نام
تھا۔ یہ اُسے دفن کر کے آئے تو ذہن پر بہت بوجھ تھا اور اِس عالم میں ایک نظم اُس کی
موت پر لکھی۔ بس یہیں سے آغاز ہوا اور پھر چل سو چل۔''48

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 128 (1,1)

عدم صاحب کا اپنا بیان ہے کہ:

"میں سکول کے زمانہ ہی سے شعر کہتا تھا۔ اُن دِنوں اختر شیرانی کی شاعری اپنے عروج پر تھی اور لاہور ہی میں مقیم تھے۔ نو آموز شاعر اُن سے بڑے متأثر تھے۔ میں نے بھی شروع میں کچھ دن اُن سے اصلاح لی۔ میں اُن کا اِتنا گرویدہ تھا کہ اظہارِ محبت کے طور پر شروع میں کچھ عرصہ میرا تخلّص بھی اختر رہا۔ اُنھوں نے مجھے فرمایا کہ تمھاری اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ جب میں نے اُن سے فارغ ہو کر شعر کہنے شروع کیے تو تخلّص بدل کر عدمؔ رکھ لیا۔ کچھ عرصہ علّامہ تاجور نجیب آبادی سے بھی مشورہ لیا لیکن یہ سلسلہ بھی کوئی زیادہ دن نہ چلا۔"49

چونکہ عدم صاحب کے زندگی میں صرف کام ہی یہ تھے کہ دفتر جاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔ شعر سے اُن کے لگاؤ بارے سید ضمیر جعفری کا کہنا ہے کہ:

'شاعری کے ساتھ چوبیس گھنٹے کی لو لگی رہتی تھی۔ ہم نے پورے عدم کو کسی بیرونی کام کی طرف صدقِ دل سے کاملاً متوجّہ نہیں دیکھا۔ آدھا عدمؔ آپ سے باتیں کر رہا ہے اور آدھا کسی غزل کے لیے نئی زمین کی تلاش میں خدا معلوم کہاں غائب ہے۔ شیو بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے چہرے پر صابن بچھ رہا ہے لیکن دوسرے ہاتھ سے اپنے اندر کسی تازہ شعر پر اُسترا پھیر رہے ہیں۔"50

عدم پیدائشی شاعر تھا۔ وہ شاعر تھا اور صرف شاعر تھا۔ اس لیے وہ لا اُبالی پن اور زُود گوئی کے باوجود بڑے غزل گو شعراء کی فہرست میں نمایاں ہے۔ عدمؔ صاحب کی پہلی کتاب "نقشِ دوام" 1934ء میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کی اشاعت کی کہانی فارغ بخاری صاحب نے اپنے خاکے "پیرِ مغاں" میں بیان کی ہے اور عدم صاحب نے یہ تمام قصّہ اپنی زبان سے بھی خلش ہمدانی صاحب کو سنایا ہے۔ عدمؔ صاحب بیان کرتے ہیں:

"علّامہ تاجور صاحب ایک ادبی پرچے کے ایڈیٹر تھے اور اُنھی دِنوں اُنھوں نے دارالاشاعت کے نام سے ادبی اور علمی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک پبلشنگ ہاؤس بھی شروع کیا تھا۔ مجھے اُنھوں نے آمادہ کر لیا کہ میں اپنی کتاب شائع

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 129 (1,1)

کرواؤں۔ پیسے میرے پاس تھے نہیں کہ کتاب چھپتی۔علامہ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ کتاب کی اشاعت کے بعد پانچ چھ ماہ میں ہی یہ لگائی گئی رقم مع منافع کے وہ مجھے لوٹا دیں گے۔ میرے پاس رقم نہ تھی۔میں نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر کتاب کا مسودّہ اور رقم علامہ صاحب کے حوالے کر دی۔علّامہ صاحب نے میری پہلی کتاب ''نقشِ دوام'' کے نام سے جلد ہی شائع کر دی۔اِس کتاب کو پورے ہندوستان میں بہت پذیرائی ملی۔میں نے چھ ماہ تک رقم کی واپسی کا انتظار کیا۔چھ ماہ گزر گئے، ایک سال گزر گیا، علّامہ صاحب نے نے نہ تو اصل زر لوٹایا اور نہ ہی کتاب سے حاصل شدہ منافع میں میرا حصّہ۔تقاضے کرتا کرتا میں آخر کار چپ ہو گیا۔اس کے بعد علّامہ صاحب سے میرے مراسم ختم ہو گئے۔اصلاح کا سلسلہ تو پہلے ختم ہو چکا تھا، اِس واقعہ کے بعد اُن سے ملنا جُلنا بھی بتدریج کم ہوتا گیا۔''51

اِس کے علاوہ دیگر ناشرین نے اُن کا کس قدر اور کس طرح استحصال کیا، اس کا بھی عدم صاحب نے تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح ایک پبلشر نے اُنھیں اغوا کر کے تین دن محبوس رکھا اور جب تک وہیں رہ کر دو کتابوں کے لیے تازہ کلام کا مواد تیار نہ ہوا، اُنھیں رِہائی نہ ملی۔52

حقیقت یہ ہے کہ عدم کا نام بکتا تھا اور پبلشرز اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے تھے۔رائلٹی کی بجائے سو، دو سو روپے میں کتاب کے حقوق خرید لیتے۔پبلشروں کے ''شر'' اپنی جگہ، اس میں عدمؔ صاحب کے لا اُبالی پن اور بے نیازی کا بھی پورا حصّہ ہے۔اے حمید صاحب لکھتے ہیں:

''عدمؔ صاحب کتابوں کے معاوضہ کے معاملے میں بھی زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح بے نیاز اور قانع تھے۔اُن کی روزمرّہ کی سب سے اہم ترین ضرورت مئے گل فام تھی۔اُنھیں پبلشرز کتاب کے معاوضے کے طور پر جو کچھ دے جاتا وہ اُسے فوراً قبول کر لیتے اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کر دیتے۔ستم ظریفی کی بات ہے کہ یہ معاہدہ عین عالم سرمستی و رندی کے دوران طے پاتا۔اُس وقت عدم صاحب ایک بوتل کے عوض اپنا پورا دیوان بیچ دینے کے موڈ میں ہوتے۔''53

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 130 (1,1)

یہ معصوم اور سادہ انسان ناشرین سے لُٹتا رہا، دوستوں سے دھوکہ کھاتا رہا، مگر انسان کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتا رہا۔ ایسے خواب جو گیتوں سے زیادہ میٹھے اور شبنم سے زیادہ دلکش ہوتے تھے۔ اُن کے پاس رسیلے قہقہے تھے، نغمے تھے، رنگین اشعار تھے۔ بہار ہی بہار۔ بقول قمر یورش:

> ''وہ اِس پھیکی اور کھوکھلی اور بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے نغموں کے، شعروں کے رنگا رنگ پھول کھلاتا اور خوش ہوتا رہا۔ وہ دغا کھا کر بھی سب پر جاں نثار کرتا رہا اور اپنے شاداب ہونٹوں پر ایک پُرنور مسکراہٹ لا کر دوستوں سے کہتا ''حضور! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب تک یہ غلام زندہ ہے۔'' 54

اِس سادہ لوح، کھرے، سچے، انسانیت کے داعی، انسانوں کے ہم درد اور دوست نواز شخص کی زندگی کے آخری سال کچھ اچھے نہیں گزرے۔ ہر وقت دوستوں میں گھرا رہنے والا عدمؔ اب بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ عدمؔ صاحب کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد کشور ناہید صاحبہ یوسف کامران کے ہمراہ، اُنھیں ملنے اُن کے گھر گئیں۔ اِس واقعہ کو وہ یوں بیان کرتی ہیں:

> ''عدمؔ صاحب کو ریٹائر ہوئے کافی مُدّت ہو گئی تھی۔ ہم نے سوچا چلو آج عدمؔ کو دیکھ آئیں۔ اُن کے گھر پہنچے تو ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ بڑھی ہوئی داڑھی، ہاتھوں کے بڑھے ناخن۔۔۔۔۔ یوسف بازار سے نیل کٹر لائے۔ میں نے اُن کے ناخن کاٹے۔ خاندان والوں میں سے کوئی بھی تو ہم کو ملنے نہ آیا۔'' 55

کشور ناہید صاحبہ کو شکوہ ہے کہ خاندان والوں میں سے کوئی بھی اُنھیں ملنے نہیں آیا۔ خاندان والے کیسے ملنے آتے؟ وہ تو ان ملاقاتوں کے ویسے ہی سخت خلاف تھے اور اُنھوں نے عدمؔ صاحب پر بھی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ خلش ہمدانی صاحب ایک طویل مُدّت کے بعد عدمؔ صاحب سے اپنی ملاقاتوں اور عدمؔ صاحب کی ذہنی اور جسمانی حالت کا ذکر بڑی دردمندی سے کرتے ہیں۔ ایک طویل مُدّت کے بعد جلال دین ٹرسٹ ہسپتال بلڈنگ، چوک اُردو بازار لاہور میں خلش صاحب کی عدمؔ سے اچانک ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا حال اور عدمؔ صاحب کی زندگی کے مسائل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 131 (1,1)

''اُنھوں (عدمؔ صاحب) نے بتایا کہ میں اب ریٹائر ہوگیا ہوں۔ لاہور میں میرے بیٹوں نے ایک پلاٹ لے کر مکان بنالیا ہے۔ میں اب وہاں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں اور میرے گھر والوں نے میرے دوستوں سے ملنے ملانے اور پینے پلانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اوّل تو مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے، اگر کبھی منت سماجت کے بعد اجازت دے دیں تو ایک ملازم کو میرے ساتھ بھیج دیتے ہیں اور اُسے گھر والوں نے سختی سے یہ ہدایت دے رکھی ہے کہ یہ ہر جگہ میری کڑی نگرانی کرے کہ میں دوبارہ پینے پلانے کا سلسلہ شروع نہ کر دوں ۔۔۔۔۔۔ خلش صاحب حضور! اب ایک طرح کی بے مقصد زندگی گزار رہا ہوں اور موت کا انتظار کر رہا ہوں۔''56

خلش صاحب کو یہ باتیں عدم صاحب نے اپنی زبان سے بتائی ہیں کہ کس طرح گھر والوں نے اُن پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور کس طرح اُن کی نگرانی کی جارہی ہے۔ اور اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے خلش ہمدانی صاحب بتاتے ہیں کہ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے ہوئے عدم صاحب مجھ سے کہنے لگے:

''دیکھو خلش صاحب! اب مجھ پر اِتنی پابندیاں ہیں کہ جب میرے گھر والوں کو یہ پتہ چلے کہ مجھ سے ملنے میرا کوئی پرانا دوست آیا ہے تو وہ مجھے اُس سے بالکل نہیں ملنے دیتے ۔۔۔۔۔ خلش صاحب حضور! اب میری کیا زندگی ہے ۔۔۔۔ چارپائی پر پڑا ایک بے جان لاشہ ہوں۔ مجھ پر تو موت اُسی دن واقع ہوگئی تھی جس دن اِس ظالم سماج نے میرے ہاتھ سے جام چھین لیا اور پھر اِس طرح میرے لرزتے ہاتھوں سے میرا قلم گر گیا۔''57

عدم صاحب نے زندگی کا طویل سفر، مے کدے کی راہ پر چلتے ہوئے طے کیا۔ مے کدے کا در بند ہوا تو اُنھوں نے بھی رختِ سفر باندھ لیا اور 10۔ مارچ، 1981ء کو اِس دنیا سے مُنہ موڑ گئے اور لاہور چھاؤنی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ اُن کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اے حمید صاحب لکھتے ہیں:

''آخر کار چلتی پھرتی سادگی اور معصومیت کا پیکر عدمؔ، لاہور کی محفلوں سے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 132 (1,1)

اُٹھ گیا۔شعر اور زندگی میں عدمؔ کی مثال ایک غیر منافق سچے انسان کی مثال تھی۔نہ شعر میں تکلّف، نہ لہجے میں، نہ زندگی میں ۔۔۔۔۔۔جیسا اُن کا دل بے ریا اور معصوم تھا، ویسی ہی اُن کی شخصیت ریا کاری اور منافقت سے پاک تھی۔‘‘58

مزاج کی نرمی، خوب صورت گفتگو، احباب نوازی، انسان دوستی، لا اُبالی پن اور بوالعجبیوں کا مجموعہ، مگر خلوص کا پیکر۔حضور! یہ تھے عدمؔ، معصوم بادہ نوش!

❁❁❁❁❁❁

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 133 (1,1)

حواشی

1۔ عدمؔ،خود نوشت۔مشمولہ فنون جدید غزل نمبر جلد دوم،جنوری،1969ء،لاہور،ص:1631

حمید ہاشمی صاحب نے عدم کی جائے پیدائش ’تلونڈی موسیٰ خاں‘ بتائی ہے۔

حمید ہاشمی و دیگر’’لاہور میں دفن خزینے‘‘علم و عرفان پبلشرز لاہور، 1988ء،ص:241

عدمؔ صاحب کا اپنا بیان دیکھا جائے تو یہ صحیح نہیں ہے۔عدمؔ صاحب کے اپنے بقول اُن کی جائے پیدائش لائل پور ہے۔

2۔ خلش ہمدانی ’’عبدالحمید عدم۔نجی و مجلسی زندگی‘‘۔کلاسیک لاہور،1994ء،ص: 189

3۔ حمید ہاشمی ’’لاہور میں دفن خزینے‘‘ ص:241

4۔ اکمل علیمی ’’لاہور کے اہلِ قلم‘‘،سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2014ء،ص: 46

5۔ شاد امرتسری ’’سید عبدالحمید عدمؔ‘‘۔مشمولہ نقوش’شخصیات نمبر‘جلد دوم،اکتوبر1956ء، لاہور، ص: 1139

6۔ عدمؔ ’’خود نوشت‘‘،مشمولہ فنون ص: 1631

7۔ حزیں کاشمیری ’’کہاں گئے وہ لوگ‘‘،اُردو کتاب گھر لاہور،2005ء، ص: 418

8۔ اے حمید’’چاند چہرے‘‘،القریش لاہور،1995ء،مشمولہ’اُردو کے شاہکار خاکے، مرتب خلیل احمد فکشن ہاؤس لاہور،2017ء،جلد اوّل،ص: 701

9۔ سیّدضمیر جعفری ’’کتابی چہرے‘‘،نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی،س۔ن،ص: 125

10۔ ایضاً: ص:129

11۔ ایضاً ص: 130

12۔ حافظ لدھیانوی ’’متاعِ گم گشتہ‘‘، ناشر حافظ سراج الحق لاہور،1999ء، ص:75,74

13۔ سیّدضمیر جعفری ’’کتابی چہرے‘‘ ص: 126

14۔ صادق نسیم ’’روشنی چراغوں کی‘‘،عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد،2003ء، ص: 213

15۔ کشور ناہید ’’مٹھی بھر یادیں‘‘،سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور،2005ء، ص: 134

16۔ حافظ لدھیانوی ’’متاعِ گم گشتہ‘‘،ص: 75

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 134 (1,1)

17۔ خلش ہمدانی ’’عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی‘‘ ص: 17,16
18۔ حافظ لدھیانوی ’’متاعِ گم گشتہ‘‘،ص: 74
19۔ اے حمید’’چاند چہرے اور’’اُردو کے شاہکار خاکے، جلد اوّل ص: 714
20۔ اسرار زیدی ’’بام و در جن سے روشن ہوئے‘‘،مقبول اکیڈمی لاہور،2007ء، ص: 95
21۔ خلش ہمدانی ’’عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی‘‘ ص: 186
22۔ ایضاً،ص: 187,186
23۔ ڈاکٹر سلیم اختر’’ درشن جھروکہ‘‘،سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور،2009ء، ص: 18
24۔ ایضاً، ص: 19
25۔ خلش ہمدانی ’’عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی‘‘ ص: 188
26۔ ایضاً،ص: 82

اپنے ایک اخلاقی جرم میں شاہدہ جیل چلی گئی۔عدم صاحب اُس کی ضمانت کی کوشش کرتے رہے۔ تفصیل خلش ہمدانی صاحب کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

27۔ ایضاً،ص: 82
28 شاد امرتسری’’سید عبدالحمید عدمؔ‘‘،مشمولہ نقوش،ص: 1140
29۔ اے حمید’’چاند چہرے‘‘، ’’اُردو کے شاہکار خاکے‘‘، جلد اوّل،ص: 706
30۔ سیّد ضمیر جعفری ’’کتابی چہرے‘‘،ص: 126
31۔ اسرار زیدی ’’بام و در جن سے روشن ہوئے‘‘،ص: 96
32۔ فارغ بخاری ’’دوسرا البم‘‘ آئینۂ ادب لاہور،س ن، ص: 151
33۔ شاد امرتسری ’’سید عبدالحمید عدمؔ‘‘،مشمولہ نقوش،ص: 1137
34۔ ایضاً،ص: 1141
35۔ حافظ لدھیانوی ’’متاعِ گم گشتہ‘‘،ص: 74
36۔ قمر یورش ’’یارانِ مے کدہ‘‘،عوامی پبلشرز لاہور،1983ء، ص: 84
37۔ سیّد ضمیر جعفری ’’کتابی چہرے‘‘،ص: 127
38۔ قمر یورش ’’یارانِ مے کدہ‘‘،ص: 84
39۔ شاد امرتسری ’’سید عبدالحمید عدمؔ‘‘،مشمولہ نقوش،ص: 1139

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 135 (1,1)

40۔ سیّدضمیر جعفری ’’کتابی چہرے‘‘،ص: 127
41۔ فارغ بخاری ’’دوسراالبم‘‘،ص: 159
42۔ شادامرتسری،’’نقوش،شخصیات نمبر‘‘،جلد دوم، ص: 1141
43۔ اے حمید، ’اُردو کے شاہکارخاکے‘،جلداوّل، ص: 700
44۔ ایضاً، ص: 704
45۔ حافظ لدھیانوی ’’متاعِ گم گشتہ‘‘،ص: 76
46۔ ایضاً‘‘،ص: 82
47۔ خلش ہمدانی’’عبدالحمیدعدم،نجی ومجلسی زندگی‘‘،ص: 17
48۔ ڈاکٹرسلیم اختر’’درشن جھروکہ‘‘،ص: 21
49۔ خلش ہمدانی’’عبدالحمیدعدم،نجی ومجلسی زندگی‘‘،ص: 189
50۔ سیّدضمیر جعفری ’’کتابی چہرے‘‘،ص: 125,124
51۔ خلش ہمدانی’’عبدالحمیدعدم،نجی ومجلسی زندگی‘‘،ص: 190،189
52۔ تفصیل کے لیے خلش ہمدانی صاحب کی کتاب’’عبدالحمیدعدمؔ،نجی ومجلسی زندگی‘‘ کے صفحات 189 تا195 دیکھے جاسکتے ہیں۔
53۔ اے حمید،’اُردو کے شاہکارخاکے‘،جلداوّل، ص: 704
54۔ قمر یورش،’’یارانِ مےکدہ‘‘،ص: 89
55۔ کشورناہید ’’مٹھی بھریادیں‘‘، ص: 135،136
56۔ خلش ہمدانی’’عبدالحمیدعدم،نجی ومجلسی زندگی‘‘،ص: 198
57۔ ایضا۔ص: 200
58۔ اے حمید’اُردو کے شاہکارخاکے‘،جلداوّل، ص: 715

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 136 (1,1)

ایک تھی پارو

پروین شاکر کو قدرت نے حُسن و جمال اور کسب وکمال کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا اور پدرسری معاشرے میں عورت کی یہ خوبیاں، اُس کے اوصاف نہیں، خامیاں بن کر سامنے آتی ہیں۔ پروین شاکر نے شاعری میں اپنے اور نوخیز لڑکیوں کے ایسے جذبوں کی عکاسی کی ہے جسے وہ محسوس تو کرتی ہیں مگر زبان پر نہیں لاسکتیں۔ پروین شاکر نے اپنے اشعار میں ایسے ہی جذباتی احساسات کو زبان عطا کی ہے اور اس معاشرے میں پروین کا خوش شکل ہونا اور بے باکی سے نوخیز جذبات کا اظہار جرم بن گیا۔ کہتے ہیں خلق تو کہنے کو فسانے مانگے اور پھر افسانے بنتے چلے گئے اور بقول رضیہ فصیح احمد:

''اُس کے بارے بُری بُری باتیں سُننے میں آتی رہیں۔''

یہ بُری باتیں کیا تھیں؟ اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ زیرِنظر مضمون اِس حقیقت اور ذرائع کو تلاش کرنے اور اصل کہانی سامنے لانے کی ایک کوشش ہے۔

مضمون میں پروین شاکر کے حوالے سے لکھے گئے مضامین، خاکوں اور چند کتابوں کا تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے اور خاص طور پر پروین شاکر کی داستانِ عشق، ازدواجی زندگی اور علیحدگی کے بعد کے حالات پر بحث کی گئی ہے، کیوں کہ مدِنظر صرف یہی مقصد ہے کہ دیکھا جائے کہ اُس کی ''داستان'' میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ؟ راقم کا نقطۂ نظر اپنی جگہ، اِس ساری بحث کے بعد قارئین خود بھی اندازہ لگالیں، حقیقت کیا ہے؟ افسانہ کیا؟

عرفانہ عزیز کی پروین

محترمہ عرفانہ عزیز پروین شاکر کی اُستاد تھیں اور اُن کا دعویٰ ہے کہ پروین شاکر میری دریافت

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 137 (1,1)

ہے اور اُس کے جوہر کو نمو کی دعوت اُنھوں نے دی ہے۔ پروین شاکر کا تعارف اور نمو کے اِس عمل کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''پروین میری ذہین ترین شاگرد تھی، عقل و دانش کا پیکر، ذہانت و فطانت میں یکتا، آداب وشائستگی کی تصویر۔ میں نے پروین کو دریافت کیا تھا۔ اُس کے جوہر کو دعوتِ نمو دی تھی۔۔۔۔ وہ بے پناہ صلاحیتیں رکھتی تھی۔ اُس کا مطالعہ ہمیشہ وسیع رہا۔ ایک مرتبہ میں نے پروین سے کہا کہ وجدانی طور پر مجھے معلوم ہے کہ تم شعر کہنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ تمھارا ادبی ذوق سُتھرا ہے۔''(1)

اُسی زمانہ میں کالج میگزین شائع ہونے والا تھا اور محترمہ عرفانہ عزیز کی خواہش تھی کہ پروین شاکر میگزین کے لیے چھ ستمبر کے حوالے سے نظم لکھے۔ اُلٹی سیدھی نظم ہوگئی تو محترمہ عرفانہ عزیز نے اُس کی نوک پلک درست کی۔ یہ پروین شاکر کی پہلی نظم تھی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ پہلے وہ کالج کے مشاعروں میں حصّہ لیتی رہی، بعد میں مختلف کالجوں اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں شرکت شروع کردی مگر ابھی تک وہ شعری رموز سے واقف نہیں تھی۔ اُسے وزن اور بحروں سے آشنائی نہیں تھی۔ وہ نظمیں، غزلیں لکھتی تھی اور محترمہ عرفانہ عزیز اصلاح دیتی تھیں۔ محترمہ عرفانہ عزیز نے گُلِ رعنا کلب کے ایک مشاعرے کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے جس میں پروین نے عرفانہ عزیز کے مشورے سے مختلف فارسی تراکیب کو ملا جُلا کر نظم لکھ کر پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ محترمہ کا کہنا ہے کہ:

''میں نے اُسے چند برس ہی اصلاح دی، پھر میں کینیڈا جابسی اور وہ احمد ندیم قاسمی کی نگہداری میں فنّی ترقی کے مدارج طے کرتی رہی۔ مگر پروین شاکر ہمیشہ یہ اعتراف کرتی رہی کہ ''میں جو کچھ ہوں آپ کی وجہ سے ہوں۔''(2)

اگر پروین یہ اعتراف کرتی ہے تو محترمہ عرفانہ عزیز بھی اُسے اپنی رُوح، ذہن اور ذات کا ایکٹینشن قرار دیتے ہوئے دونوں کے درمیان جو ذہنی مفاہمت تھی اُس کا ذکر کرتی ہیں، اور اُس کی المناک موت اور اپنے دُکھ اور غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جسے میں نے زندگی کی طرح چاہا اُس کا مدفن دیکھنے کا حوصلہ نہیں۔''(3)

مصنّفہ پروین شاکر کی موت کے بعد محسوس کرتی ہیں کہ اب کاسۂ دل میں ایک مسلا ہوا پھول ہے جس میں میری پہچان بھی تھی۔

اِس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مصنّفہ کو پروین شاکر سے کتنی محبت تھی اور اُس کی موت کا

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 138 (1,1)

صدمہ اُن کے لیے کتنا گہرا ہے۔

مضمون میں پروین شاکر کی ذہانت، اُس کے جوہر کی نمو، ابتدائی شاعری اور پھر اُس سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے مصنّفہ نے پروین کی پہلی چاہت جو اُن کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں، کا بھی سرِعام ذکر کیا ہے۔ اِس ابتدائی چاہت کے وقت پروین شاکر کی عمر ابھی صرف سولہ برس تھی اور وہ ایف اے کی طالبہ تھی۔ اپنی یادوں کو دُہراتے ہوئے مصنّفہ لکھتی ہیں:

''وہ اُداس سی سردیوں کی شام بھی یاد آتی ہے جب پروین گوشۂ چشم میں اشک گرفتہ لیے گھر مجھ سے ملنے آئی۔

میں نے کہا ''کیا بات ہے؟''

''مس! میں ایک جذباتی حادثے سے دوچار ہوں۔''

''تم اپنی توجہ فی الحال تعلیم اور شعروسخن پر رکھو۔''

''مس! وہ مجھے ''خدا'' کا درجہ دیتا ہے۔''

''محبت ایک انتہائی خوب صورت جذبہ ہے پروین، لیکن ہمارا زُود رنج معاشرہ ایسی بغاوت کو پسند نہیں کرتا۔ اگر دل کی تہذیب کی حدود میں تم اِس معصوم سی چاہت کی پرورش کر سکتی ہو تو میں تمھارے ساتھ ہوں، لیکن تمھارے والدین اسے گوارا نہیں کریں گے۔ تمھاری نسبت طے ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔''

پروین کی یہ پہلی محبت تھی، تب وہ سولہ برس کی تھی۔''(4)

اپنی بات کے پختہ ثبوت کے لیے، تاکہ کسی کو معمولی سا بھی شُبہ نہ رہ جائے، محترمہ عرفانہ عزیز نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے اُس کے محبوب کو بھی دیکھا تھا۔ اس بارے لکھتی ہیں:

''ذہین اور بانکا تھا، بہت جوشیلا، چڑھتے دریا کی طرح لہجہ وادیوں میں گونجتے ہوئے آبشاروں کی طرح۔''(5)

بس اِتنا ساذکر ہے، مگر وہ ذاتِ شریف ہے کون؟ اس کی کسی کو کوئی خبر نہیں۔ پروین کا یہ تجربہ کیسا رہا؟ اس عشق یا چاہت کا انجام کیا ہوا؟ اِس بارے عرفانہ عزیز اور ادبی تاریخ کے اوراق مکمل خاموش ہیں۔

پروین ابھی سولہ برس کی نادان لڑکی ہے، زمانے کے نشیب و فراز سے واقف نہیں۔

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 139 (1,1)

مانا کہ وہ ایک جذباتی حادثے سے دو چار ہوگئی اور اُس نے عرفانہ عزیز صاحبہ کو اپنی ایک ہمدرد، غم گسار اور محسن سمجھ کر اُن سے رازِ دل کہہ دیا۔ محترمہ عرفانہ عزیز صاحبہ نے اُسے جو نصیحت یا دل جوئی کی وہ اپنی جگہ اہم، مگر بات یہ ہے کہ عرفانہ عزیز صاحبہ تو ایک جہاندیدہ اور سمجھ دار خاتون ہیں، اِس راز سے اُن کے سِوا واقف بھی کوئی نہیں تو کیا اِس راز کی تشہیر ضروری تھی؟ بچیوں کی ایسی حماقتوں یا چاہتوں کو چھپایا جاتا ہے یا سرِ عام نشر کیا جاتا ہے؟

اُن کی اِس گوہر افشانی کو کیا کہا جائے کہ پروین کی المناک موت کے ایک ہفتہ بعد ہی اُنھوں نے اِس خبر کو نشر کرنا ضروری سمجھا ہے۔ کیا یہ پروین کی شہرت ہے یا رُسوائی ہے؟ عرفانہ عزیز صاحبہ جو پروین کو اپنی ایکسٹینشن قرار دیتی ہیں اور اُن سے والہانہ محبت کا دعویٰ کر رہی ہیں وہی بہتر بتا سکتی ہیں۔ پروین نے جو بڑی راز داری سے اُن سے اپنی چاہت کا ذکر سولہ برس کی عمر میں 1968ء میں کیا تھا، 1995ء میں اُس کا چرچا چار سُو ہے۔

محترمہ عرفانہ عزیز نے اُس عشق کے منطقی انجام کے بارے تو کچھ نہیں بتایا، البتہ یہ ضرور تحریر کیا ہے:

''اور پھر خوشبو وجود میں آ گئی
قریہ قریہ کُو بہ کُو پھیل گئی۔'' (6)

اور اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے عالیہ جلیل شاہ نے لکھ دیا:

''خوشبو' میں موجود محبوب ایک ہرجائی محبوب ہے ۔۔۔ اور یہ ایسا ہرجائی محبوب ہے جو اپنی غلطی پر کبھی پشیماں نہیں ہوتا۔ پروین شاکر کا حقیقی محبوب بھی ایک ہرجائی محبوب ہے۔'' (7)

یہ جو پہلی چاہت کا محبوب ہے، وہ تو بقول پروین شاکر، اُس کو ''خدا'' (دیوتا) کا درجہ دے رہا ہے، اس کے سِوا اُس بارے اور کوئی بھی بیان سامنے نہیں آیا۔ اگر وہ اِس درجہ چاہت کا اظہار کر رہا ہے تو وہ ہرجائی کیسے ہُوا؟

دوسری محبت کے بارے عالیہ جلیل شاہ نے محبوب کو ہرجائی ضرور لکھا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی تحریر کر دیا ہے کہ اُس نے پروین کا رِشتہ طلب کیا تھا۔ انکار پروین کے والد نے کیا۔ اِس صورت میں وہ ہرجائی کیسے ہوا؟ قصّے ہی گھڑنے ہوں تو کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے، عرفانہ عزیز صاحبہ نے پہلی چاہت یا تجربے کا جو ذکر کیا

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 140 (1,1)

ہے وہ سولھویں برس کی واردات ہے یعنی 1968ء کا قصّہ جب ابھی پروین کو شاعری کے اوزان اور بحروں سے بھی آشنائی نہیں تھی۔ ’’خوشبو‘‘ 1977ء میں منظرِ عام پر آئی جب پروین کی شادی کو بھی ایک برس گزر چکا تھا اور دوسرے عشق کی ڈیپریشن سے بھی نجات حاصل ہو چکی تھی، اور ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا شاعری واقعی شاعر یا شاعرہ کی آپ بیتی ہوتی ہے؟ اِس میں شک نہیں کہ ’’خوشبو‘‘ کی شاعری ایک ناتجربہ کار دوشیزہ کے جذبات کی عکاسی ہے، مگر یہ کوئی آپ بیتی نہیں ہے۔ یہ اُس کے بیتے دِنوں کی گواہی نہیں بلکہ ہمارے سماج کے گھٹن زدہ ماحول اور اس میں پلنے والی مجبور لڑکیوں کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ ہر اُس معصوم لڑکی کی کہانی جو رواجوں کے آہنی حصار میں عمر قید کاٹ رہی ہے۔ یہ ٹھیک کہ شاعری میں شاعر یا شاعرہ کے اپنے جذبات و احساسات بھی ہوتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عہد اور سماج کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ شاعری میں شاعر کے مشاہدات بھی ہوتے ہیں جس سے گرد و پیش کے ماحول کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اور ’’خوشبو‘‘ کی شاعری ان ہی جذبات و احساسات، مشاہدات اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اسے صرف آپ بیتی کہنا زیادتی بھی ہے اور ناسمجھی بھی۔

بہرحال عرفانہ عزیز صاحبہ نے سولہ سال کی لڑکی جسے وہ اپنی روح، ذہن اور ذات کا ایکسٹینشن قرار دیتی ہیں اور والہانہ محبت کا اظہار بھی کرتی ہیں، اُس کا وہ راز، جس کی وہ اکیلی رازداں تھی، فاش کر کے اچھا نہیں کیا۔ مرنے کے بعد بھی لوگ ابھی تک اُس کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں۔ اب اُن کے ہاتھ ایک اور موضوع آ گیا ہے جسے وہ چسکے لے کر بیان کرتے پھر رہے ہیں۔ آہ! پروین شاکر، جس سے محبّت کرنے والے بھی اُس کی رُسوائی ہی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں دانستہ یا غیر دانستہ۔

ثروت حسین سے عشق کی کہانی

پروین شاکر اور ثروت حسین کے انتقال کے بعد زاہد حسین بھٹی نے 1997ء میں ڈاکٹر اجمل نیازی کی نگرانی میں ایم اے اُردو کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ ’’ثروت حسین، شخصیت اور فن‘‘ کے عنوان سے لکھا، جسے بعد میں ’’کاندھے پہ دھرے ساز‘‘ کے نام سے 1998ء میں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس کتاب میں بھٹی صاحب نے پروین شاکر اور ثروت حسین کے عشق کی داستان لکھی ہے۔ یہ اُن دِنوں کی داستان ہے جب ثروت حسین اور پروین یونیورسٹی میں پڑھتے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 141 (1,1)

تھے۔ثروت حسین ایم۔اے اُردو کے سال اوّل اور پروین شاکر ایم۔اے انگریزی کے آخری سال میں۔

بھٹی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”رومان پسند اور حُسن پرست ثروت حسین نے پروین شاکر کو لائبریری کے باہر دیکھا اور آن کی آن میں اُس پر فریفتہ ہو گئے اور اپنے بھائی شوکت عابد کو بتایا کہ میرے ہاتھ خزانے سے بھی قیمتی چیز لگ گئی ہے۔بعد میں ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی شاعری دِکھانے لگے۔اس سے آگے بات نہیں بڑھی۔ثروت حسین کے دوست احمد جاوید کا بیان بھٹی صاحب نے درج کیا ہے وہ کہتے ہیں:

”ثروت کو یہ احساس تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“(8)

خوش گمانی اور خوش توقعاتی کی بنا پر وہ کہا کرتے تھے:

”پروین کو مجھ سے عشق ہے۔“(9)

ساری کتاب میں اشارَتاً بھی ذکر نہیں ہے کہ پروین شاکر نے کبھی کہیں اس کا کسی بھی طرح معمولی سا بھی اظہار کیا ہو۔

حُسن پرست ثروت حسین اپنی خوش گمانی میں مبتلا، اُس کے عشق کے افسانے گھڑ کے دوستوں کو سُناتے رہے، مگر دوستوں کے بیانات سے بھی کوئی ایسا اِشارہ نہیں ملتا کہ پروین شاکر نے کبھی بھول کر بھی محبت کا اظہار کیا ہو۔

احمد ہمیش صاحب کو پروین شاکر سے یہ شکایت تھی کہ اُس نے احمد ندیم قاسمی صاحب کو اپنا عمو جان بنالیا، جس وجہ سے اس کو بہت فائدہ ہوا اور وہ اُونچا اُڑنے لگی۔احمد ندیم قاسمی صاحب سے یہ تعلق اور اُونچی اُڑان نے احمد ہمیش جیسے لوگوں کے وہ اوسان خطا کیے اور ہوش اُڑائے کہ وہ پروین کے مرنے کے بعد بھی اُس کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، اور اُس کے ان جرائم کے سبب وہ وہ اسکینڈل بنائے کہ خدا کی پناہ!

احمد ہمیش صاحب نے ثروت حسین سے لے کر صہبا اختر، اسد اشرف ملک اور اصغر مہدی تک اُس کی داستانیں بیان کر کے اُس پر مکاری اور بے وفائی کے الزامات لگائے ہیں اور بھٹی صاحب ان حاسدانہ باتوں کو حقیقت سمجھ کر بغیر سوچے سمجھے اور کسی ثبوت کے بغیر ان باتوں کو دہرائے جا رہے ہیں۔احمد ہمیش کے حوالے سے بھٹی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ”دو چیزیں

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 142 (1,1)

ثروت حسین کو خودکشی کی طرف لے گئیں:

1۔ فن کی ناقدری

2۔ پروین شاکر کی بے وفائی

فن کی ناقدری کا دُکھ تو اُنھیں ناقابلِ یقین حد تک تھا اور پروین کی شہرت، پذیرائی اور اُونچی اُڑان کے سبب اُس سے یک طرفہ محبت کے باوجود جیلس بھی تھے۔

پروین شاکر اور ثروت حسین کا تعلق یا رابطہ 1971ء۔ 1972ء میں رہا جب وہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔ اُس کے بعد کسی قسم کے تعلق یا رابطے کا ذکر زاہد حسین بھٹی صاحب نے نہیں کیا۔ البتہ ثروت حسین کی خوش گوار ازدواجی اور نجی زندگی کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ 1993ء میں وہ اپنے دونوں پاؤں سے ضرور محروم ہوئے تھے لیکن لوگوں کی غیر معمولی پذیرائی نے اُن میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور زندگی دوبارہ معمول پر آ گئی تھی۔ اِس حادثے کے بعد ثروت حسین کو نئی زندگی گزارنے کے رموز اور ڈھنگ آ گئے تھے اور اب وہ زیادہ پُر اعتماد اور مطمئن نظر آتے تھے۔ یہاں تک تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ نہ تو کبھی پروین شاکر نے اُس سے کوئی پیمانِ وفا باندھا اور نہ ثروت حسین نے اُس سے اپنے کسی پرانے یک طرفہ عشق کا ذکر اور اُس کی بے وفائی کی کہانی دُہرائی ہے۔ اور پھر 24 برس بعد اچانک یاد آیا کہ میرے ساتھ تو ایک عورت (پروین شاکر) نے بے وفائی کی تھی۔ مجھے تو خودکشی کرنی چاہیے تھی۔ اور یوں 9 ستمبر 1996ء کو (پروین شاکر کے انتقال کے تقریباً دو برس بعد) خودکشی کر لی۔

افسوس ہے کہ زاہد حسین بھٹی صاحب نے تحقیق کا حق پورے طور پر ادا نہیں کیا۔ ثروت حسین سے لے کر اصغر مہدی تک پروین شاکر پر عشق کا ڈھونگ رچانے کی تہمت لگائی ہے۔ احباب سے سُنی سُنائی باتوں کا ذِکر کیا ہے۔ کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیے اور احباب کے بیانات سے بھی کوئی ایک اشارہ بھی فراہم نہیں کر سکے جس سے پروین شاکر کی محبت کا اظہار ہوتا ہو۔ اُس پر مکاری اور بے وفائی کے الزام لگاتے ہوئے بھٹی صاحب سادگی میں پروین شاکر کو بدنام کرنے کی سازش میں شریک ہوئے ہیں۔

پروین شاکر اور ثروت حسین دونوں اِس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ اخلاقیات اور مشرقی روایات کا تقاضا تھا کہ اگر دونوں میں کبھی مراسم رہے بھی تھے (وہ بھی اس تحقیقی مقالے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 143 (1,1)

سے ثابت ہوتا ہے کہ یک طرفہ تھے) تو اُن کا ذکر سرسری سا ہوتا تو بہتر تھا۔ دونوں مرحومین کو بدنام کرنے اور خاص طور پر پروین شاکر کا دامن داغ دار کرنے کی اِتنی بھرپور کوشش نہ کی جاتی۔ دوست احباب کے بیانات سے یہی نتائج اخذ کر لینا کافی تھا کہ اُن کے دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ خلق خدا تو کہنے کو افسانہ مانگتی ہے اور محقق نے سادگی میں مشرقی روایات کو پامال کیا اور اس افسانے میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش کوئی اِتنی قابل تعریف نہیں ہے۔

پروین شاکر کے دوسرے عشق کی کہانی

عرفان جاوید نے پروین شاکر کے لڑکپن کے سولھویں برس کے پہلے عشق کو مجنونانہ عشق قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد دوسری محبت کو سچی محبت قرار دیا ہے۔ اس سچی محبت کے ذکر سے پہلے کچھ اور باتیں:

پروین شاکر ابھی کراچی ہی میں تھی، اُس وقت کو یاد کرتے ہوئے کشور ناہید نے لکھا ہے:

> ''یوسف جمال پروین پر لٹو ہونے کی کوشش کرتے، مگر بات ہنسی میں ٹل جاتی۔ کوشش تو کئی سینیئر شاعروں نے بھی پروین پر ڈورے ڈالنے کی، کی۔ میرا ہنسنا اور جمال احسانی کی فقرے بازی ان سارے قصوں کو ہوا میں اُڑا دیتی۔'' (10)

سینیئر شاعروں کی کوششیں اور اس پر کشور ناہید کے قہقہے، سینیئر شاعروں کی حماقتوں کی داستان ہے۔ کشور ناہید مزید لکھتی ہیں:

> ''پروین کے اِرد گرد بہت سے نئے لوگ اور پیپلز پارٹی کے وزیر بھی، اُس کی خوب صورت شاعری سُن کر گرویدہ ہو گئے تھے۔'' (11)

یہ اقتباس پڑھ کر تو ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے یہ جملے بے ساختہ ذہن میں گونجنے لگتے ہیں:

> ''مردوں میں اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ عورت ہے (اور خوب صورت عورت ہے)۔ دوسری، تیسری اور چوتھی وجہ بھی یہی ہے۔ جب کہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنی شاعری میں عورت کو فطری خواہشات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور مسٹر اُلّو کا کہنا ہے کہ عورت کو فطری خواہشات کے ساتھ دیکھنا مرد کی فطری خواہش ہوتی ہے۔'' (12)

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 144 (1,1)

مرد کی یہ فطری خواہش ہی مرد کی ذہنیت کا راز فاش کرنے کے لیے کافی ہے۔ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''ہر دوسرا نوجوان اس کی شاعری کا دیوانہ ہے، ہر پہلا اُس کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اُس کی آدھی کتابیں تصویر کی وجہ سے بکیں اور آدھی تصوّر کی وجہ سے۔(تصویر اس کی اور تصور لوگوں کا۔''(13)

مرد حضرات اس تصویر اور تصوّر کے رجحان اور چکّر سے باہر نکل ہی نہیں سکے۔اس سے ہی مردانہ ذہنیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔

فرحت پروین ملک اِس بات اور انداز کی وضاحت یوں کرتی ہیں:

''اگر وہ کسی سے ملنے سے انکار کرتی ہے تو لوگ اُسے مغرور اور بد دماغ کہتے ہیں۔اگر کسی سے خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے تو اُس کا اسکینڈل بنا دیا جاتا ہے۔دراصل لوگ اُس کی شاعری کے کردار کو خود سے منسوب کر کے اُس کی چاہت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ہمارا معاشرہ رائی کا پہاڑ، پر کا کوّا بنانے میں ماہر ہے۔''(14)

لوگوں کا کیا ہے؟ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ جو عورتیں گھروں سے نکلی ہیں، شاعری (اور وہ بھی پروین شاکر جیسی) کرتی اور مشاعرے پڑھتی پھرتی ہیں، یہ تو نکلی ہیں ''مرد'' کی تلاش میں ہیں اور وہ ''مرد'' ہم ہی تو ہیں۔سینیئر ہونے کے باعث وہ ڈورے ڈالنے اور جال پھیلانے میں لگے رہتے ہیں اور پر سے کوّے بنا کر اُڑاتے رہتے ہیں اور یار لوگ ان کوّوں کی اُڑانیں دیکھ کر اور کائیں کائیں سن کر صرف خوش ہی نہیں ہوتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں کہ اس میں مردانہ تسکین کے کئی پہلو اور سامان ہے۔گھوم پھر کے دوبارہ پروین شاکر کے دوسرے عشق ہی کی جانب آتے ہیں اور جناب احمد پراچہ سے رجوع کرتے ہیں جن کی کتاب ''پروین شاکر، احوال و آثار'' 2003ء میں علم وعرفان پبلشرز لاہور نے شائع کی۔مصنّف کا دعویٰ ہے کہ:

''اپنی بساط کے مطابق چار سال کی جدو جہد، تحقیق اور عرق ریزی کے بعد اس کتاب پر کام مکمل کیا ہے۔''(15)

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 145 (1,1)

مصنّف نے کتاب لکھنے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ:

”میری کوشش یہ رہی ہے کہ یہ کتاب شاعرہ مرحومہ کی یادوں کو جگمگانے اور تازہ کرنے کا ایک پیش نامہ ثابت ہو۔“ (16)

یادوں کو جگمگانے کے لیے اُنھوں نے پروین شاکر کی ”داستانِ محبت“ کو بطورِ خاص منتخب کیا ہے۔ عشق کی دوسری واردات بیان کرنے سے پہلے ایک مفروضہ قائم کیا ہے جسے قدرتی امر کا نام دیا ہے۔ احمد پراچہ صاحب لکھتے ہیں:

”رومانوی شاعری کے لیے دل شکستہ اور محبت کی لرزش بہت ضروری ہے۔ پروین نے بھی محبت کی۔ طالب علمی کے زمانے میں یہ ”فطری امر“ تھا کہ سینیئر جماعت کے خوش رُو، خوب رُو اور مردانہ وجاہت کے حامل طلباء سے محبت کے جذبات برانگیختہ ہوں۔“ (17)

طالب علمی کے زمانے میں اِس ”فطری امر“ کی وجہ سے کتنے ”طلباء“ کی مردانہ وجاہت نے پروین کے محبت کے جذبات کو ”برانگیختہ“ کیا؟ ”عرق ریزی“ سے کتاب لکھنے والے مصنّف کا قلم اس مقام پر خاموش ہے۔ اب طالب علمی کا زمانہ بیت گیا ہے اور پروین شاکر ”فطری امر“ کے مقام سے بخیریت اگلی منزل تک پہنچ چکی ہے مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ عشق کی ایک اور واردات آن وارد ہوئی، مگر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ یونیورسٹی کے طلباء تو جذبات ہی برانگیختہ کرتے رہے اور پروین کا دل ایک سرکاری ملازم لے اُڑا۔ احمد پراچہ لکھتے ہیں:

”اب صورتِ حال مختلف تھی۔ سرکاری دفتر میں ملازمت کرنے والا ایک شخص، پروین کے دل کو بھا گیا۔ پروین نے اُس کو اپنے تصوّرات اور خوابوں میں شریک کیا اور اُس کی رفاقت سے اُسے حظ حاصل ہوتا۔ پروین نے اس تعلق خاطر کو بہت سنجیدگی سے لیا اور اُس کے جذبات زیادہ گہرے تھے۔“ (18)

اِس اقتباس میں ایک دو باتیں بطورِ خاص اہم اور توجہ طلب ہیں۔ مذکورہ شخص سرکاری دفتر میں ملازم تھا، ملازمت کی نوعیت کیا تھی؟ پروین شاکر اُس کی رفاقت سے کب اور کہاں حظ حاصل کرتی رہی اور اِس ”حظ“ کی نوعیت کیا تھی؟ مصنّف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ”پروین کے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 146 (1,1)

جذبات زیادہ گہرے تھے۔ یہ جذبات کتنے گہرے تھے؟ ان جذبات کی پیمائش کس نے کی اور ماپنے کا پیمانہ کیا تھا؟ مصنّف نے یہ وضاحت تو نہیں فرمائی، البتہ مزید یہ لکھا ہے کہ:

''وہ لڑکا شادی کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا۔ اُس لڑکے کی آرزو اور اُمنگ بہتر کیریئر تھا۔۔۔۔۔اُسے احساس تھا کہ ایسی شادی اُسے زندگی میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار نہیں ہوگی۔'' (19)

لڑکے کا ظرف دیکھیے، وہ شادی جیسے مقدس بندھن کو بھی کاروبار سمجھتا ہے اور اُسے زندگی میں بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے معاون اور مددگار جانتا ہے، اُسے احساس تھا کہ پروین شاکر سے شادی بہتر کیریئر کے لیے معاون ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اِس محبت یا عشق میں کتنا غیر سنجیدہ تھا۔ مگر پروین تو اُسے اپنا آئیڈیل سمجھ کر اپنا مستقبل اُس سے وابستہ کیے بیٹھی تھی۔ احمد پراچہ صاحب کے مطابق:

''کم عمر اور جذباتی پروین کے لیے یہ سب کچھ صدمہ سے کم نہ تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔'' (20)

اور احمد پراچہ صاحب اپنے تجربے کی روشنی میں دل ٹوٹ جانے کے عمل پر یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ دل پر ایسی خراش اور ایسے زخم وقتی طور پر نہیں ہوتے بلکہ پائیدار ہوتے ہیں اور اگر حالات بہتر بھی ہو جائیں تو اس نوعیت کے زخم بھرتے نہیں۔

عرفان جاوید صاحب نے اس لطیف گلابی جذبے کی کہانی اس سے مختلف لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ جذبات میں سچی اور وہ وعدوں کا پاس دار تھا۔ یہ بچی ابھی کی کھٹی کنواری مہک لیے ہوئے تھی اور اس کا محبوب اس کے بقول برسات کی خوشبو کے مانند تھا۔۔۔۔۔وہ ذہین، خوب رُو، باوقار، برسرِ روزگار اور اس سے محبت کرنے والا تھا۔ دونوں کی جوڑی خوب سجتی تھی۔ لڑکے نے اپنے اہلِ خانہ کو رشتے کے لیے پروین کے ہاں بھیجا۔''(21)

عرفان جاوید صاحب نے لڑکے کو خوب رُو، باوقار، وعدوں کا پاس دار اور پروین سے محبت کرنے والا برسرِ روزگار بتایا ہے۔

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 147 (1,1)

عالیہ جلیل شاہ کے پاس بھی ایک کہانی ہے۔وہ لکھتی ہیں:

’’پروین شاکر اپنی ذات کی تمام سچائیوں سمیت اُس کی محبت میں سنجیدہ تھیں جب کہ لڑکے کا مزاج مختلف تھا۔وہ اس محبت میں سنجیدہ نہ تھا۔‘‘(22)

عالیہ جلیل شاہ کو اِس محبت میں غیر سنجیدہ لڑکے سے ایک اور بھی شکایت ہے،وہ لکھتی ہیں:

’’اُس ہرجائی نے سی۔ایس۔پی افسر بن جانے کے بعد ایک معمولی گھرانے کی لڑکی کو اپنانا گوارا نہ کیا۔‘‘ (23)

احمد پراچہ صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ ابھی بہتر کیریئر کی تلاش میں ہے اور شادی کو بھی اِسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے اور عالیہ جلیل شاہ نے اُس کا ہرجائی پن ثابت کرنے کے لیے اُسے سی۔ایس۔پی بنا دیا ہے اور اب تو اُسے معمولی گھر کی لڑکی گوارا نہیں۔اب کس کے بیان پر اعتبار کیا جائے؟ عالیہ جلیل شاہ نے بات یہیں ختم نہیں کی بلکہ پروین شاکر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کو بھی اسی جذباتی کیفیت کا سبب قرار دیا ہے۔محترمہ عالیہ لکھتی ہیں:

’’پروین شاکر کا مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا اور اسے نمایاں حیثیت میں پاس کرنا بھی اسی جذباتی حقیقت کو لیے ہوئے ہے کہ پروین شاکر اپنے آپ کو معاشی و معاشرتی لحاظ سے اپنے محبوب کے برابر لانا چاہتی تھی اور یہ بتانا چاہتی تھی کہ عہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔جس عہدے کی خاطر ’’خوشبو‘‘ کی محبت نے ’’خوشبو‘‘ کو چھوڑا تھا وہی عہدہ بلکہ اس سے اعلیٰ ’’خوشبو‘‘ کی اس شاعرہ نے بھی حاصل کرلیا۔‘‘(24)

پروین شاکر نے مقابلے کا امتحان 1981ء میں پاس کیا۔وہ اُس وقت ڈاکٹر نصیر علی کی اہلیہ تھیں اور بیٹے مراد کی ماں بھی بن چکی تھیں اور رفاقت جاوید کے بقول:

’’اولادِ نرینہ کے بعد اُسے اپنے روشن مستقبل اور خوش حال دِنوں پر بھروسہ ہوگیا۔وہ سمجھی اب زندگی مکمل ہوگئی ہے۔کہیں بھی خلا نظر نہیں آیا۔‘‘ (25)

یعنی اب وہ عشق محبت قصّہ پارینہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے مستقبل کو روشن سمجھ رہی ہیں۔ ایسے میں بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے ایسی کہانی بیان کرنا کہ مقابلے میں بیٹھنا اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا اُسی جذباتی اُبال کے سبب ہے،کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے اور اسے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 148 (1,1)

آسانی سے تسلیم بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال دل پر خراشوں اور زخموں کے باوجود، پروین کی خواہش اور لڑکے کو اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اس کے گھر والے رشتہ مانگنے آئے تو پروین کے والد بھڑک اُٹھے، بہت برہم اور ناراض ہوئے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُن کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی کرلے، وہ بھی دوسرے فرقے کے فرد سے۔ احمد پراچہ صاحب کے بقول:

> ''اپنی والدہ کے ذریعے بات طے ہونے کی ناکامی کے بعد پروین نے خود یہ مسئلہ اُٹھایا۔ اُس کے والد سخت ناراض ہوئے اور بھڑک اُٹھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کی بیٹی کی شادی وہیں ہوگی، جہاں وہ چاہیں گے۔ اِس سے پروین کے دل پر ایک اور زخم لگا۔ اُسے اپنے والد کے انکار سے صدمہ پہنچا۔'' (26)

اب اگر وہ ''ہرجائی'' رشتے کا طلب گار ہے اور پروین اور اُس کی والدہ کے اصرار کے باوجود پروین کا والد ناراض بھی ہوتا ہے اور رِشتے سے انکار بھی کرتا ہے تو کیا قصوروار پھر اُسی لڑکے کو ٹھہرایا جائے اور اُسے ہرجائی ہونے کا طعنہ دیا جائے۔

احمد پراچہ اور عالیہ شاہ نے اُسی لڑکے کو خود غرض، مفاد پرست، ہرجائی، کم ظرف اور شادی کو بھی بہتر کیریئر کے لیے بطور سیڑھی استعمال کرنے والا لکھا ہے اور عرفان جاوید صاحب نے اُسے خوبرو، باوقار، محبت کرنے والا اور وعدوں کا پاس داری کرنے والا بتایا ہے۔ اور نجمہ خانم اُس بارے یہ انکشاف کیا ہے:

> ''وہ شخص جو پروین کی زندگی اور سوچ کا انقلابی ہوا، آج کراچی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور ملک و قوم کی خدمت سچائی اور دیانت داری سے کر رہا ہے۔۔۔۔۔ پروین کی خواہش پر جب وہ اور ان کے گھر والے ملنے آئے تو یقیناً ایک لاجواب انتخاب تھا۔ کہیں کوئی کمی نہ تھی اور صرف فرقوں کا فرق جس نے ممکن کو ناممکن بنا دیا۔ اُن کی عالی ظرفی اور شرافت اور کردار کی عظمت نے اس گھرانے پر کبھی حرف نہ آنے دیا اور ہمیشہ اس گھر کی دُعائیں اور نیک تمنائیں، اعلیٰ قدر جذبہ اُن کے اور اُن کے گھر والوں کے مرہونِ منت رہے گا اور ہمیشہ اُن کی بیوی اور وہ خود پُرخلوص اور فراخ دلی، انکساری اور جذبۂ انسانیت کے گراں قدر جذبات کے ساتھ اِس خاندان

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 149 (1,1)

کے کام آنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔“(27)

نجمہ خانم ملک نے یہ کتاب پروین کی بڑی بہن نسرین شاکر کی زیرِنگرانی لکھی ہے۔ یعنی اس میں گھر کی گواہی موجود ہے۔نجمہ خانم ملک نے اُس ہرجائی اور کم ظرف لڑکے کی شرافت، اعلیٰ ظرفی اور کردار کی عظمت کے گُن گائے ہیں اور اب بھی نہ صرف وہ بلکہ اُس کی بیوی بھی خلوص اور انسانیت کے گراں قدر جذبے کے تحت اس خاندان کے کام آنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

اب کیا کیا جائے،کسی کی مانیے، جو بھی پروین شاکر کی بزم سے ہو کر آیا ہے،نئی خبر لے کر آیا ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ گھر کی گواہی زیادہ معتبر ہوتی ہے۔اُسے ہی درست تسلیم کرنا چاہیے۔

محترمہ فرحت پروین ملک نے بھی مختصر طور پر پروین شاکر کی محبت کی کہانی لکھی ہے اور وہ اُسے اُس کی پہلی محبت کہتی ہے۔مصنّفہ نے اُس کے محبوب سے بھی آگاہ کیا۔باقی کسی بھی قلم کار نے نام نہیں بتایا۔وہ یا تو نام لکھنے سے گریز کرتے رہے یا اُنھیں نام کی خبر ہی نہیں تھی۔بہر حال فرحت پروین ملک صاحبہ لکھتی ہیں:

”اُس کی پہلی محبت اسد اشرف ملک تھے۔اسد اشرف ملک کے گھر سے پروین کا رشتہ بھی آیا تھا مگر پروین کے والد شاکر مرحوم نے انکار کر دیا۔اس کی وجہ مسلک کا مختلف ہونا تھا۔“ (28)

احمد ہمیش نے بھی پروین کے معاشقوں کا ذکر کرتے ہوئے اسد اشرف ملک کا ذکر کیا ہے مگر اُنھوں نے تو اُن کے علاوہ اور بھی کئی نام بتائے ہیں، جن میں صہبا اختر، ثروت حسین اور اصغر مہدی بھی شامل ہیں۔(29)

مگر یہ سب کہانیاں ہیں۔اصل نام اسد اشرف ملک ہی ہو سکتا ہے۔اِس عشق کی کہانی نام لیے بغیر اکثر خاکہ نگاروں اور کتابوں کے مصنّفین نے بیان کی ہے۔رشتے کی بات بھی سب

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 150 (1,1)

نے لکھی ہے اور شاکر مرحوم کے انکار کی وجہ سے بھی سب متفق ہیں، البتہ اسد اشرف ملک کے کردار اور رویّے بارے مختلف آراء سامنے آئی ہیں، جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

پروین شاکر کے والد شاکر حسین زیدی ثاقب نے اسد اشرف ملک اور اُس کے اہلِ خانہ کو رِشتے سے انکار کیا تو پروین شاکر کا ردِّ عمل کیا تھا؟ احمد پراچہ صاحب جو پروین شاکر کے دل پر آنے والی خراشوں تک سے آگاہ ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''رسم و رواج کی پابند خاتون کی حیثیت سے اُسے (پروین شاکر کو) اپنے والدِ محترم کی خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ وہ اپنے والد کی چہیتی بیٹی تھی اور وہ اُنھیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' (30)

ایک مشرقی عورت کی طرح اُس نے باپ کے شملے کی لاج رکھ لی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے من میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اُس کا کردار اور دامن اُجلا تھا۔ اُس پر اُنگلی اُٹھانا اُس کے جذبے کی بھی اور اُس کی پاک دامنی کی بھی توہین ہے۔

عرفان جاوید صاحب لکھتے ہیں:

''پروین نے باپ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا مگر گھر والوں کے انکار نے پروین کو نفسیاتی اضمحلال سے دوچار کر دیا۔ نازک جذباتی لڑکی تھی۔ قلبی سانحات سہہ نہ پائی اور اُسے چند ایک بار بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔''(31)

لوگوں کی رائے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے محترمہ رفاقت جاوید نے اِس ''داستانِ عشق'' کی وضاحت اپنے انداز میں یوں کی ہے:

''اگر پروین نے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا تو یہ حق اُسے اِسلام نے سونپ رکھا ہے۔ والدین کے انکار کی صورت میں مشرقی لڑکی ہونے کے ناطے سرِ تسلیم خم کرنا، اُس کی فرمانبرداری کی غمازی کرتا ہے۔ اُس کے لیے والدین کی خوشی، عزت اور محبت کو اہمیت دینا لازم تھا۔ لیکن مضمحل ہونا بھی انوکھی بات نہ تھی۔ کچھ ذہنی طور پر افسردہ اور پشیمان رہنے سے ڈپریشن میں چلی گئی۔''(32)

محترمہ رفاقت جاوید نے صحیح کہا ہے کہ ''پسند'' کا حق اُسے اسلام نے دیا، باپ کے انکار

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 151 (1,1)

پر مشرقی لڑکی ہونے کے ناطے باپ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ قصّہ ختم۔ باقی باتیں مصنّفہ کے بقول:

''سب دوسروں کی قیاس آرائیاں تھیں۔''

اگر اِسے سچ مان بھی لیا جائے تو کیا اِس سارے قصّے کو اِتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ضروری تھا؟ کیا اِتنا بیان کرنا کافی نہیں تھا کہ وہ ایک شخص کو پسند کرتی تھی اور اُس کی خواہش پر اُس کے گھر والوں نے رشتہ طلب بھی کیا مگر باپ کے انکار پر اُس نے باپ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا اور پھر تمام عمر اُس کا ذکر زبان پر نہیں لائی۔ کیا رفاقت میں حظ اُٹھانے، گہرے جذبات کی پیمائش اور دل کی خراشوں کی گنتی اور دل کے زخموں کے بھرنے یا نہ بھرنے کا ذکر ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو میں یہ کام احمد پراچہ صاحب ہی کو سونپتا ہوں۔ وہی عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اسے بہتر انداز میں سرانجام دے سکتے ہیں۔

ویسے اِس کام کے پیچھے مقصد کیا ہے؟ پروین شاکر کی شہرت یا رُسوائی؟ خدا جانے!

ازدواجی زندگی۔ آغاز، اختتام

اب یہ عشق وِشق کے قصّے تو ختم ہوئے مگر کہانی میں ایک نیا کردار داخل ہوتا ہے۔ پروین کی والدہ کی ماموں زاد بہن کا بیٹا ڈاکٹر نصیر علی، جسے پروین کی بیماری کے دوران اکثر بلایا جاتا ہے اور بقول عرفان جاوید:

''بہ ظاہر تو اس خاندان کے پروین کے خاندان سے خاصے خوش گوار تعلقات تھے مگر مزاج مختلف تھے، مگر ڈاکٹر نصیر علی کے دل میں پروین کو اپنانے کی خواہش اُبھری اور اُس نے بڑے اصرار سے اظہار کر دیا۔ اُس کی والدہ ایک روایتی خاتون تھیں جو اپنے بیٹے کے لیے امیر خاندان سے گھریلو دُلہن لانا چاہتی تھیں جو گھر گرہستی کے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 152 (1,1)

معاملات سنبھال سکے ۔ پروین شاعرہ تھی ، معلّمہ تھی ۔ معروف تھی ، خوش شکل تھی ، سو معاملاتِ دیگر بھی غلط طور پر منسوب ہو جاتے تھے اور وہ نصیر کی والدہ کی خواہشات کے مطابق نہ تھی ۔ جب نصیر کا اصرار بڑھا تو طوعاً و کرہاً اُس کے اہلِ خانہ نے آمادگی ظاہر کر دی ۔'' (33)

اِدھر آمادگی سامنے آئی ، اُدھر پروین کی والدہ کے دل میں وسوسے کیکڑوں کی طرح پنجے جمانے لگے ۔ اُنھیں اس خاندان میں بناوٹ اور گُھٹن کا احساس ہوتا ۔ شادی کے معاملات بڑھے تو پروین کے وسوسوں میں بھی اضافہ ہوا ۔ اِس موقع پر اُسے احمد ندیم قاسمی کی یاد آئی ۔ اُس نے اُن سے گزارش کی کہ وہ کراچی آ کر نصیر سے مل کر اپنی رائے دیں ۔ پروین کی گزارش پر قاسمی صاحب بہ طورِ خاص لاہور سے کراچی گئے ۔ نصیر ، اُس کے خاندان اور پروین کے خاندان والوں سے بات چیت کی اور اِس رِشتے پر اپنی پسندیدگی کا اِظہار کر دیا ۔

احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں :

''میں نے بیٹی (پروین) کے گھر میں اُس کے منگیتر سے ملاقات کی اور اپنے مثبت تاثر کا اظہار کیا ۔''(34)

قاسمی صاحب کے مثبت تاثر اور پسندیدگی کے اظہار کے باوجود پروین کی بڑی بہن نسرین شاکر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ۔ بقول نجمہ خانم ملک :

''پروین کو اُس کی آپا نے بہت سمجھایا کہ میں تمھیں اپنے مشاہدے کی روشنی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں ۔''(35)

مگر پروین تو قاسمی صاحب کی رائے کو ہی ترجیح دے رہی تھی ۔ اُس لیے نسرین نے ڈاکٹر نصیر کو گھر بلا کر کہا :

''دیکھیے ڈاکٹر صاحب ! پروین اُن لوگوں میں سے ہے جن کے لیے بہت سی زبانیں بولنے والی ، بہکانے والی ہیں اور بہت سے قلم تنقید کرنے والے ہیں ۔ ایسے لوگ ہمیشہ حاسدوں میں گھرے رہتے ہیں ۔ اگر آپ میں یہ ظرف ہے کہ آپ ہر قسم کی بات سُن کر ، پڑھ کر برداشت کر سکتے ہیں تو فیصلہ کریں ورنہ ان کے لیے رِشتہ کی کمی نہیں ۔''

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 153 (1,1)

اِس پر ڈاکٹر نصیر کے الفاظ تھے:

''آپ یقین کریں میری ذات سے آپ لوگوں کو اور پروین کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور ان تمام باتوں کی میں قطعی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔''

اُن کی اِس ہمت کو دیکھ کر گھر والے تو مطمئن ہو گئے جب کہ پروین کی امّی ہمیشہ خوف زدہ رہیں کہ یہ لوگ بدمزاج ہیں اور پروین خوش نہ رہ سکے گی۔'' (36)

بہر حال قاسمی صاحب کی رائے کو حتمی سمجھا گیا اور اکتوبر 1976ء میں پروین سے نصیر کی شادی ہو گئی۔ عرفان جاوید نے اِس شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یوں پروین کی زندگی کی کہانی میں اندھا موڑ آیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس موڑ کی دوسری جانب اندھی کھائی ہے یا روشن منظر۔'' (37)

پروین روشن منظر کی آس لگائے نصیر کے مشترکہ خاندان میں منتقل ہو گئی اسے خبر نہ تھی کہ قدرت اسے اندھی کھائی کی طرف لے کر جا رہی ہے۔ نصیر کے مشترکہ خاندان میں اس کی دو شادی شدہ بہنیں ایک شادی شدہ بھائی اور اس کے والدین شامل تھے۔ خاندان میں رات کے کھانے کی ذمہ داری پروین کو سونپی گئی اور بقول عرفان جاوید:

''پروین کھانے پکانے کے معاملات سے ناواقف تھی پکوان کی کتابوں اور بڑی بہن نسرین کی رہنمائی میں کھانا بنانا سیکھنے لگی اسے روزانہ کئی روٹیاں پکانا پڑتی رات گئے تک جو جوٹھے برتن دھونے پڑتے۔'' (38)

دن رات یوں ہی گزر رہے تھے کہ پروین کی ازدواجی زندگی کا خوشگوار ترین دور شروع ہوتا ہے ڈاکٹر نصیر جو فوج میں ملازم تھے اُن کا تبادلہ ایبٹ آباد ہو گیا کالج میں چھٹیوں کے دوران پروین بھی ایبٹ آباد چلی گئی عرفان جاوید کے مطابق:

''پروین اس دور کا بہت مسرت سے ذکر کیا کرتی تھی مگر یہ وقت پل بھر میں گزر گیا اور واپس کراچی آنا پڑا۔'' (39)

پروین کی ساس سخت مزاج تھیں اور پروین سے اس کی تلخ کلامی چلتی رہتی۔ گو پروین تو تکار سے گریز کرتی، پر معاملات خرابی کی طرف بڑھ ہی جاتے۔ 20 نومبر 1979 کو پروین

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 154 (1,1)

کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور نصیر صاحب بیٹے کو اس کی پیدائش کے دو روز بعد دیکھنے آئے۔ ڈاکٹر نصیر کے اس رویے بارے محترمہ رفاقت جاوید لکھتی ہیں۔:

''نصیر رشتہ داروں اور ماں کے کہنے پر مراد کو دیکھنے میں تاخیر کرنے لگے البتہ پروین کے رونے دھونے پر ان کی تشریف آوری دو دن بعد ہوئی۔''(40)

نصیر کی ماں اور دیگر رشتہ داروں کا یہ رویہ کیوں تھا؟ گو مصنفہ نے اس پر تو روشنی نہیں ڈالی، البتہ بہت بعد کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ پروین کو:

''سسرال کے ہر رشتے سے وحشت محسوس ہوتی تھی اور وہ ان کے ذکر ہی سے خوفزدہ ہو جایا کرتی تھی اسے ان رشتوں سے کبھی شفقت و محبت اور ہمدردی کی قطعاً توقع نہیں ہوتی تھی۔''(41)

اب نہ جانے سسرال میں پروین پر کیا قیامت گزری تھی کہ اسے ان سسرالی رشتہ داروں سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی اور ان سے کسی قسم کی شفقت و محبت تو دور کی بات ،،ہمدردی کی بھی توقع نہیں رہی تھی مراد کی پیدائش کے وقت ڈاکٹر نصیر کی بے رخی سے ان رشتوں کے رویے بارے تھوڑا بہت اندازہ ہو ہی جاتا ہے یہ بیٹے کی پیدائش کے وقت 1979 میں جب کہ شادی کو ابھی صرف تین سال ہوئے ہیں شوہر اور پھر بیٹے کے باپ کا رویہ ہے مگر اس سے بھی پہلے 1978 میں سرفراز اقبال نے پروین شاکر سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کے مینٹل پیس پر اس کی شادی کی تصویر پڑی تھی لیکن پروین کی اکیلی دلہن بنی ہوئی تصویر یہ میرے لیے اچنبھے کی بات تھی کہ دولہا غائب ہو تصویر کے اکیلے پن نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔''(42)

سرفراز اقبال ایک عورت ہے۔ وہ عورت کی سائیکی بھی جانتی ہے اور عورت کے دکھ بھی، دولہا کے بغیر اکیلی دلہن کی تصویر، تصویر کے اس اکیلے پن نے سرفراز اقبال کو بہت کچھ بتا دیا اور یہ ''بہت کچھ'' ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے اللہ نے عورتوں کو بھی عجیب شعور بخشا ہے سرفراز اقبال نے 1978 میں اکیلی دلہن کی تصویر دیکھ کر بہت کچھ سمجھ لیا اور فرحت پروین ملک نے مراد

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 155 (1,1)

کی پیدائش سے پہلے پروین سے اپنی پہلی ملاقات میں مستقبل کے خدشات کو بھانپ لیا۔اور وہ بھی ان دونوں جب اس کی شادی کو ابھی صرف دو تین برس ہوئے تھے اور وہ بظاہر خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔

فرحت پروین ملک نے پروین سے کہا تھا:

''تمہیں رشتہ دار سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی ۔ڈر ہے تمہاری سسرال والے تمہاری شاعری کو کہاں تک برداشت کریں گے شاعری اور شادی کو قائم رکھنا مشکل نہ ہو جائے۔'' (43)

دونوں کے خدشات درست ثابت ہوئے شاعری اور شادی ایک ساتھ نہ چل سکے.ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے ڈاکٹر نصیر اور پروین شاکر کے مزاجوں کے فرق کو یوں بیان کیا ہے:

''سائنس اور ادب دو مختلف میدان ہیں اس نے دو متضاد سروں کو ملانے کی کوشش میں ایک ڈاکٹر سے شادی کرلی ایک طرف دل ہی دل اور دوسری طرف دماغ ہی دماغ یہ عشق ومحبت سے دو چار وہ دو اور دو چار۔''(44)

سرفراز اقبال اور فرحت پروین ملک نے تو پہلے ہی حالات کو بھانپ لیا تھا مراد کی پیدائش کے وقت ڈاکٹر نصیر کے رویے سے عام آدمی کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پروین اور نصیر ریل کی پٹڑیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے جو ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود الگ ہی رہتے ہیں۔ عرفان جاوید صاحب نے ڈاکٹر نصیر صاحب کو بنیادی طور پر ایک اچھا اور بھلا مانس آدمی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک ایسا بھلا مانس تھا،

''جسے پروین کی مشاعروں میں شرکت پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ کئی مرتبہ ادبی مجالس میں ساتھ بھی ہوتا پروین نے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا ارادہ کیا تو بھی نصیر نے اس سے بھر پور تعاون کیا اور تیاری کے دوران سہارا دیا مگر امتحان میں امتیازی کامیابی کے بعد کئی مسائل پیدا ہو گئے۔'' (45)

مان لیا پروین اور اس کا شوہر ڈاکٹر نصیر دونوں ہی عمدہ انسان تھے، مگر جس طرح

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 156 (1,1)

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک صاحب نے لکھا ہے یہ بھی مان لینا چاہیے کہ ایک دوسرے سے مختلف تھے ۔شاید وہ ایک دوسرے کے لیے نہیں تھے ۔مزاج کا فرق شدت اختیار کرتا گیا اور ایک دن:

''نصیر نے پروین کے والد صاحب کو صاف کہہ دیا کہ وہ لکھنا پڑھنا اور سروس کرنا چھوڑ دیں مکمل گھریلو بیوی بن کر رہنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ناممکن ہے میں دنیا کی باتوں کا سامنا نہیں کرسکتا۔''(46)

یہ وہی نصیر صاحب ہیں جنہوں نے نسرین شاکر سے کہا تھا:

''اِن باتوں کی میں قطعی کوئی پرواہ نہیں کرتا یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔''

ڈاکٹر نصیر صاحب کا بدلہ ہوا رویہ، ان کے خاندان کے لوگوں کی بدمزاجی، ڈاکٹر نصیر کی شاعری اور ملازمت بارے اعتراض اور ناپسندیدگی کے ساتھ ساتھ ان دونوں عمدہ انسانوں میں کچھ چالاک، خودغرض، حاسد اور مفاد پرستوں کی چالیں بھی بدگمانی اور غلط فہمی پیدا کرنے میں کامیاب رہیں ۔نجمہ خانم ملک کے بقول:

''چالاک، خودغرض اور مفاد پرست لوگوں نے پروین کی شہرت اور ترقی کو پھلتا پھولتا دیکھ کر ایسی چال چلی کہ پروین کے بارے میں افواہیں اڑا کر پروین کے ہر قریبی عزیز رشتہ دار اور دوستوں کو ان سے بدگمان کر دیا جائے، کیونکہ جب تک ان مخلص لوگوں کا حصار نہیں ٹوٹے گا ان کو بدنام کرنا اسکینڈل بنانا اور خوفزدہ کرنا آسان نہیں ہوگا اور وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔''(47)

پروین اور ڈاکٹر نصیر کی آخری ملاقات فروری 1987ء میں ہوئی۔ کچھ شرائط طے کر کے شادی کا یہ بندھن ٹوٹ گیا۔طلاق کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ:

''پروین دوسری شادی نہیں کرے گی بصورت دیگر اسے اپنے بیٹے مراد کی تحویل سے دستبردار ہونا پڑے گا۔''(48)

طلاق کے بعد پروین شاکر نے بڑی تلخ زندگی بسر کی ۔طلاق کو اپنی نادانی سمجھتی رہی اور سمجھتی رہی کہ میرے سر سے چادر اتر گئی ہے ۔رفاقت جاوید لکھتی ہے:

''پروین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے کہا رف (رفاقت) میں تو بہت نادان

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 157 (1,1)

نکلی اس کا نام میرے نام کے ساتھ جڑا رہتا میں طلاق کے خلاف آواز اٹھاتی احتجاج کرتی میں نے اس کا کہا کیوں مانا بے شک وہ دوسری شادی کرتا مجھ سے کنارہ کشی کر لیتا اس کا نام میرے سر کی چادر رہوتا وہ میرا لباس ہوتا۔“(49)

مرد دوسری شادی کرے، ہمارے سماج میں یہ عورت کے لیے بڑا عذاب ہے۔مگر علیحدگی یہ اس سے بھی بڑا عذاب ہے۔جسمانی تقاضے اپنی جگہ،لیکن تنہائی،اس سے پیدا ہونے والا کرب اور پھر عدم تحفظ کا احساس بڑا اذیت ناک ہے پروین شاکر کو بھی تنہائی کے کرب نے ڈس لیا۔وہ حسرت و یاس میں ڈوب گئی یہ ناکامی زندگی کا سب سے بڑا روگ بن گئی۔اور وہ تمام عمر اس احساس سے باہر نہ نکل سکی۔ممتاز مفتی صاحب نے اپنے خاص انداز اور اسلوب سے، پروین شاکر کی زندگی کے سب سے بڑے حادثے یا المیے کو قدرت کے حیلوں کے سر تھوپ کے، اسے قدرت کی جانب سے،نوازنے کا حصہ اور عمل قرار دیا ہے۔ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

”بے چاری، قدرت! پروین شاکر کو نوازنے کے لیے اسے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔خانہ آبادی کی عمومیت سے بچانے کے لیے،میاں کے ساتھ ان بن کا کانٹا لگا دیا۔پروین کی طبیعت میں زود حسی کی پخ لگا دی،ایسی کہ نارمل ازدواجی تعلقات کی متحمل نہ رہے،یہ سب اس لیے کہ علیحدگی کے سوا چارہ نہ رہے۔۔۔۔۔۔اور اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ پھر سے خانہ آبادی پر مائل ہو جائے،قدرت نے اس کے دل میں غیر عقلی اندیشے پیدا کر دیے ہیں۔“(50)

ممتاز مفتی صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو”نوازے“ جاتے ہیں ان پر اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے،ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔ممکن ہے ممتاز مفتی جو کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں قدرت ہی پروین شاکر کو بڑی شاعرہ بنانے کے لیے یہ ساری چارہ سازی کرتی رہی ہو،مگر پروین کی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ دکھوں سے بھری ہوئی اذیت ناک اور قدرت کی جانب سے ایک سزا نظر آتی ہے،اور پروین نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

”زندگی نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا“

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 158 (1,1)

اس ایک فقرے میں اس کی زندگی کی تمام سرگزشت موجود ہے گو زندگی نے اسے بہت کچھ دیا تھا مگر معاشرے نے اس سے چھینا بھی بہت کچھ تھا ممتاز مفتی صاحب نے تو اپنے مخصوص انداز میں علیحدگی کو قدرت کی نوازش قرار دیتے ہوئے اس کی خوش قسمتی ٹھہرایا ہے اب خدا جانے اس طرح مفتی صاحب نے اس کے دکھوں کی شدت کو کم کرنے اور اسے دلا سہ دینے کی کوشش کی ہے یا مردکی ''بے حسی'' کا مظاہرہ کیا ہے. خاوند سے ''علیحدگی'' خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو، عورت کے لیے. بہت اذیت ناک ہوتی ہے اور مرد اس عورت کا کتنا بھی خیر خواہ یا ہمدرد ہو اس اذیت کو محسوس اور عورت کی ذہنی حالت کا ادراک کر ہی نہیں سکتا اور زیادہ سے زیادہ اسے قدرت کے نوازنے کا حیلہ قرار دے کر جھوٹی تسلی دے سکتا ہے اور یہی طریقہ مفتی صاحب نے بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا ہے۔

طاہر مسعود صاحب نے بھی پیروین شاکر کا خاکہ لکھتے ہوئے اس کی ازدواجی الجھنوں اور تلخیوں کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''سننے میں آیا تھا کہ ''میاں'' اچھی طبیعت کے ہیں لیکن ''بیگم'' کی شاعرانہ سرگرمیوں اور میل جول سے خوش نہیں ہیں ازدواجی زندگی پروین کی الجھنوں اور تلخیوں کا شکار ہی رہی ان کے سامنے اپنا شاندار کیریئر تھا۔ کیریئر کی دوڑ دنیا میں کامیابی کی دوڑ ہوتی ہے. جس دوڑ میں پروین شریک تھی'' (51)

بیگم کی شاعرانہ سرگرمیوں اور کیریئر کی دوڑ کا ذکر کر کے مصنف نے ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور تلخیوں کی مکمل ذمہ دار پروین شاکر کو ٹھہرایا ہے۔ اور ''علیحدگی'' کے عمل کے بارے بھی یہی کہا ہے کہ:

> وہ جب تک جیتی رہیں، غالباً مطمئن ہی رہیں کہ سودا خسارے کا نہ کیا'' (52)

مرد یہ جملے بڑے آسانی سے لکھ سکتا ہے اسے اس بات کا احساس ہو ہی نہیں سکتا کہ عورت کا گھر اُجڑے تو اس پر کیا گزرتی ہے اور پھر وہ مرد جس کے دل میں ایک '' طعنہ'' چھری بن کر ترازو ہو (اس کی تفصیل آگے آئے گی) وہ تو یہی لکھے گا کہ وہ مطمئن تھی اور سمجھتی تھی کہ اس نے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 159 (1,1)

''خسارے کا سودا''، نہیں کیا پروین شاکر کے اوپر علیحدگی کے بعد کیا گزری؟ اور اچھی طبیعت کے ''میاں'' کا رویہ کیسا تھا؟ سسرال کا رویہ کتنا وحشت ناک تھا؟ کاش مصنف نے ادھر بھی توجہ فرمائی ہوتی۔ اگر تھوڑا سا تعصب، حسد اور مردانگی کو ایک جانب رکھ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پروین اس رشتے سے خوش تھی۔ وہ خوش تھی کہ اسے ایک پیار کرنے والا، روشن مستقبل والا، خوب رو خاوند ہی نہیں بلکہ بھیڑیوں کے اس معاشرے میں اس کی عزت و آبرو کا محافظ بھی مل گیا ہے۔ اور پھر اولادِ نرینہ کے بعد تو اسے اپنے روشن مستقبل اور خوشحال دنوں پر مکمل بھروسہ ہو گیا تھا وہ سمجھتی تھی کہ زندگی اب مکمل ہوگئی ہے مگر پھر اس کے تسلی بخش احساس پر بے اعتباری کی مہر ثبت ہوگئی اور اپنائیت غیریت میں بدل گئی۔ محترمہ رفاقت جاوید لکھتی ہیں:

> ''پروین اور نصیر مختلف دنیاؤں کے دو باشندے تھے۔ زندگی کے بارے میں دونوں کے خیالات مختلف تھے۔ ان باتوں کے باوجود پروین اپنے ازدواجی رشتے کو مضبوط اور اپنے گھر کو ہنستا بستا دیکھنا چاہتی تھی۔''(53)

پروین نے تلوّن مزاج لوگوں کی فطرت کو سمجھ لیا تھا پھر بھی ''ماں'' بننے کے بعد اس نے اپنے گھر کو آباد اور خوشحال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کی خاطر قربانی اور ایثار کے لیے بھی ہر لمحہ تیار رہی، پھر بھی لعن طعن مقدر رہا اور آخر کار بندھن ٹوٹ گیا۔ اس بندھن ٹوٹنے کا پچھتاوا پروین کو عمر بھر رہا پروین نے ایک بار محترمہ رفاقت جاوید سے کہا تھا:

> ''عورت اور مرد کو اللہ تعالیٰ نے یکساں صلاحیتوں کے ہمراہ یکساں احساسات و جذبات کے ساتھ ایک ہی طریقے سے پیدا کیا ہے تو پھر عورت اپنے شوہر کے لیے گالی کیسے ہوگئی؟ اس کی پراپرٹی کیسے بن گئی؟ میاں بیوی کے نباہ کی کچھ شرائط ہوتی ہیں نصیر ان سے بے خبر تھا وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا کہ ''عورت'' کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ وہ بھی اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر اپنی زندگی اپنی پسند سے گزارنے کا حق رکھتی ہے۔''(54)

پروین کی بات اور خیالات کو رد کرنا آسان نہیں اور اس بات سے اختلاف بھی ممکن

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 160 (1,1)

نہیں کہ عورت کے بھی حقوق ہیں اور اسے بھی اپنی پسند سے زندگی گزارنے کا حق ہے مگر مرد کی حاکمیت کے اس معاشرے میں کوئی بھی ''نصیر'' اسے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں وہ رشتوں کو کچے دھاگوں کی طرح توڑ سکتا ہے مگر عورت کو حقوق نہیں دے سکتا، اسے کیریئر کی دوڑ کے طعنے دے سکتا ہے، اس کے کرب کو نہیں سمجھ سکتا۔ علیحدگی پروین کی زندگی کا سب سے بڑا روگ تھا اور اسے یہ رشتہ ٹوٹنے کا قلق عمر بھر رہا۔ رفاقت جاوید کا کہنا ہے کہ:

''وہ عید پر نئے کپڑے پہننے سے گھبراتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ میں سہاگن نہیں ہوں میرے لیے عید پر بننا سنورنا واجب نہیں یہ مجھے زیب نہیں دیتا۔''(55)

طاہر مسعود صاحب تو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ سمجھتی تھی خسارے کا سودا نہیں کیا، محترمہ رفاقت جاوید نے ایک اور واقعہ تحریر کر کے بھی اس لغو اور بے معنی الزام کو جھٹلایا ہے اس واقعہ سے پروین شاکر کے ذہنی کرب، احساس تنہائی، دکھ، غم، افسوس اور پچھتاوے کا پتہ چلتا ہے۔ محترمہ لکھتی ہیں:

''پروین نے اسلام آباد میں گھر لیا تو میں نے اس کے گھر کو پیار، لگن، چاؤ اور قرینے ،سلیقے سے سجا دیا تھا۔ پروین نے گھر کو پرستائش نظروں سے دیکھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر حسرت و یاس بھرے لہجے میں نم آلود آنکھوں سے دیکھ کر کہا، رفاقت! جب میرا گھر اجڑ رہا تھا تو اس وقت آپ کہاں تھیں؟ کاش اس وقت آپ کا ساتھ ہوتا تو میرا گھر بچ گیا ہوتا۔''(56)

عورت چاہتی ہے اُس کا گھر بچا رہے، اُس کی چھت چاہے سیلن زدہ ہو، اُسے تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔ بہر حال کوشش اور خواہش کے باوجود وہ گھر نہ بچا سکی۔ اُس کا گھر اُجڑ گیا۔ فصلِ گُل کی سرگوشی اور سرشاری کا عہد ختم ہوا اور اُسے گھنے جنگل میں سرسراتے بچھوؤں کے درمیان زندگی گزارنی پڑی۔ زندگی کا یہ دَور کتنا کٹھن اور مشکل تھا، اِس ذکر سے پہلے ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے۔ شادی کی ناکامی نے اُسے تنہا کر دیا تو اب لوگوں کو افسانے گھڑنے کا موقع مل گیا۔ سرفراز اقبال نے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے علیحدگی کے بعد:

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 161 (1,1)

''وہ جس سے شادی کرنا چاہتی ہے اُس شخص کے بچے نہیں مان رہے۔''(57)

اِس مقام پر سرفراز اقبال کے اندر کی عورت بھی جاگ اُٹھتی ہے اور اُس کا تانیثی شعور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ سرفراز اِقبال لکھتی ہیں:

''ارے بھائی، مرد کو کوئی روک سکتا ہے اگر وہ شادی کرنا چاہے۔ اگر بہانے بنائے تو دوسری بات ہے۔ یقیناً وہ عورت سب کچھ سمجھتی ہو گی لیکن اب وہ کیسے کہے۔''(58)

یعنی عورت، مرد کو اور مرد کے بہانوں کو خوب سمجھتی ہے۔ مگر پھر بھی اِس سماج میں مجبور ہے، اپنی بدنامی کے خوف سے کچھ کہے بھی تو کیسے کہے۔

سرفراز اقبال نے یہ بالکل ایک نئی بات کا انکشاف کیا ہے جس کا کسی دوسرے خاکہ نگار نے ذکر نہیں کیا۔ اِسے کچھ لوگوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہی کہنا چاہیے۔

سرفراز اقبال نے تو صرف دوسری شادی کی خواہش ہی کا ذکر کیا ہے مگر فرحت پروین ملک نے پروین کی دوسری شادی کروا کر دم لیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''پروین شاکر کی دوسری شادی بھی دو ماہ میں ختم ہو گئی۔ اُس آدمی نے (مصنّفہ نے آدمی کا نام نہیں بتایا) پارو پر مقدمہ کر دیا۔ جمیل الدین عالی نے مقدمہ اپنے اثر و رسوخ سے ختم کروایا۔ یہ بات عالیؔ مرحوم نے فون پر مجھے (مصنّفہ کو) بتائی تھی۔''(59)

محترمہ فرحت پروین ملک نے عالیؔ مرحوم سے سُن سنا کر یہ بات لکھی ہے، کسی اور ذرائع سے اِس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ویسے بھی طلاق کے وقت جو شرائط طے ہوئی تھیں اُن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ پروین شاکر دوسری شادی نہیں کرے گی ورنہ اُسے اپنے بیٹے مراد کی تحویل سے دست بردار ہونا پڑے گا اور پروین کو بیٹے سے مستقل جدائی بالکل برداشت نہیں تھی۔ وہی تو اب اُس کی زندگی کا اثاثہ تھا۔ اِس لیے اُس سے دست بردار ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اِس بنا پر دوسری شادی کا قِصّہ صحیح نہیں لگتا۔ ایک اور بات بھی ہے کہ اُس کے ''مہربان''، جو اُس کی چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اُس کے دامن پر کیچڑ اُچھالنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے، وہ اِتنی بڑی خبر یا بات پر کیسے خاموش رہے؟ چونکہ اِس حوالے سے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 162 (1,1)

کوئی بات سنائی نہیں دی ، اِس لیے دوسری شادی کے قصّے کو ماننا مشکل ہے ۔اسے بھی ایک افسانہ ہی کہہ کر بات یہیں ختم کر کے آگے بڑھتے ہیں ۔

❀❀❀

جب پروین شاکر کا اپنا گھر نہ بچا تو اُس نے اپنے بیٹے مراد کے ہمراہ اِسلام آباد میں کرایہ پر گھر لے لیا۔رفاقت جاوید اس گھر کو''شیشے کا گھر'' کہتی ہیں ۔ایسا گھر جس کے گرد و پیش ایک ہجوم تھا جو اس کی ایک ایک حرکت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔اس بھیڑ میں اُس کے اپنے کولیگز، سینئیر افسران، دوست احباب، شاعر، ادیب اور رِشتہ دار سرِفہرست تھے اور:

> ''اُس کی ہر ادا پر اعتراض ہونے لگا۔مشرقی روایات کے ٹھیکے داروں نے شیشے کا گھر توڑ کر اُسے سنگلاخ آہنی قلعے میں مقیّد کرنا چاہا تا کہ نئی نسل کے جوان خون میں جو حِدّت سما گئی ہے اور دِلوں میں آزادیٔ نسواں نے جو ہلچل مچا دی ہے اُس پر بروقت قابو پا لیا جائے اور اُس کے قلم کو توڑ دیا جائے ۔''(60)

بات صرف اِتنی سی نہیں تھی کہ جوان خون میں سمائی حِدّت پر قابو پانا یا آزادیٔ نسواں کی ہلچل کو روکنا، بلکہ اس کے پیچھے تو اپنی نفسانی خواہشات کی کہانی بھی موجود ہے ۔نجمہ خانم ملک کا کہنا ہے:

> ''پروین کے اِرد گرد ہمیشہ کچھ منافق اور مارِ آستین جیسے لوگ موجود رہے، جنھوں نے ہمیشہ پروین کے کردار پر کیچڑ اُچھالا اور اس کی شہرت کو داغ دار، ترقی کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی ۔'' (61)

تنہائی، اس سے پیدا ہونے والے کرب اور عدمِ تحفظ کے احساس سے دو چار پروین شاکر کا، بلیک میل کرنے، اسکینڈل گھڑنے اور کردار پر کیچڑ اُچھالنے والے، مارِ آستین اور حسد و انتقام کے شعلوں میں بھڑکے ہوئے لوگوں سے سامنا تھا۔حسد و انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور پروین تنہا، اُن میں جھلس رہی تھی ۔فرحت پروین ملک کا کہنا ہے:

> ''پروین شاکر ہمیشہ افواہوں کی زد میں رہی ۔''جنگ'' اخبار اُس کی تصاویر اس انداز سے شائع کرتا جیسے وہ شاعرہ نہیں بلکہ فلم سٹار ہے ۔''(62)

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 163 (1,1)

اس کے پیچھے مقصد کیا تھا؟ کیا یہ اُس کی پبلسٹی کا عمل تھا یا کسی نیت کا ''فتور''، سمجھنے کی بات ہے۔فرحت پروین ملک مزید لکھتی ہیں:

''ہمارے گھر جو بھی شاعر، ادیب آتے وہ اُس کی شاعری پر کم، شخصیت کے عیب و ہُنر پر ضرور تبصرہ کرتے۔''(63)

اِس عیب و ہُنر پر تبصرے میں حسد اور انتقام کی چنگاریاں سُلگتی صاف نظر آتی ہیں۔ فرحت پروین ملک نے بہت سی باتوں کا برملا ذکر کیا ہے۔ یہ باتیں بنانے والوں میں سینئیر اور جونیئر دونوں گروپ کے شاعر اور ادیب موجود ہیں بلکہ بعض خواتین کے حسد کی بھی کہانی ہے۔

نظیر صدیقی صاحب نے ''خوشبو'' کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جو ''فنون'' میں شائع ہوا تو ساقی فاروقی صاحب نے یوں گلہ کیا:

''پچیس سال کی لڑکی پر تم پچیس صفحات کا مضمون لکھتے ہو، میرے لیے تمھارے پاس وقت نہیں۔''(64)

ضیاء جالندھری صاحب نے فرحت پروین ملک سے پوچھا:

''یہ مضمون کیا آپ کی اجازت سے لکھا گیا؟''

''اجازت کیا؟ میری خواہش پر لکھا گیا۔''

''واقعی!'' ضیاء صاحب نے حیرت سے کہا۔''(65)

یہی نہیں، ضیاء جالندھری صاحب نے پی۔ٹی۔وی اسلام آباد سنٹر کے مشاعرے کے لیے فہرست بنائی اور پروین شاکر کو اُس فہرست میں شامل نہ کیا۔ پوچھنے پر بتایا:

''وہ بہت مغرور لڑکی ہے۔میں کراچی گیا تھا، اُس نے ملنے سے انکار کر دیا۔''(66)

ضمیر جعفری مرحوم نے مصنّفہ سے پوچھا:

''پروین شاکر کی شاعری کا Source of inspiration کیا ہے؟''

مصنّفہ کو اُن کا سوال اچھا نہیں لگا۔احتراماً صرف اِتنا کہا:

''میں شعر نہیں کہتی، مجھے نہیں معلوم۔'' مگر یہ ضرور جی چاہا، پوچھوں،

''یہ سوال آپ نے کتنی شاعرات سے کیا ہے؟ یہ نظرِ کرم صرف پروین شاکر پر کیوں؟''

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 164 (1,1)

(67)

مصنّفہ کے بقول، اسلام آباد میں

''ایک افسانہ نگار اور ایک شاعر اکثر آدھی رات کو خوف ناک آواز میں فون کیا کرتے تھے۔'' (68)

کاش مصنّفہ نے اُن کے نام بھی لکھے ہوتے تو اُن کی خوف ناک آواز کے ساتھ اُن کے خوف ناک چہرے بھی عوام کے سامنے آجاتے۔

ایک ٹی۔وی پروگرام میں میزبان نے شاہدہ حسن سے سوال کیا:

''آپ بھی اچھی بھلی شاعرہ ہیں۔مگر آپ کی شہرت پروین شاکر جیسی کیوں نہیں؟

شاہدہ حسن نے طنزیہ انداز میں جواب دیا:

''میں وہ ''سب کچھ'' نہیں کرتی جو پروین کیا کرتی تھیں۔'' (69)

محترمہ فرحت پروین ملک نے تو اس کا جواب صرف اِتنا ہی لکھا ہے:

''پروین اپنی مثال آپ تھی۔وہ مجسّم شاعری تھی۔''

کاش! اب کوئی شاہدہ حسن سے یہ سوال بھی کرے کہ وہ بتائیں کہ وہ ''سب کچھ'' کیا تھا؟ کھل کے بتائیں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ صرف طنز کافی نہیں۔مگر نہیں، وہ ''سب کچھ'' جدھر محترمہ اشارہ کر رہی ہیں، پروین وہ نہیں کرتی تھی۔اُس کی شہرت کا سبب اُس کی شاعری ہے اور آپ میں اِتنا ظرف نہیں ہے کہ اس کا اعتراف کر سکیں کہ وہ ہم سے بہتر شاعرہ تھیں۔الزام تراشی اور کیچڑ اُچھالنے سے کسی کے قد کاٹھ کو کم نہیں کیا جا سکتا۔اِس سے صرف اندر کی جلن اور حسد کا اِظہار ہوتا ہے اور بس۔

وہ، وہ تو واقعی اپنی مثال آپ تھی اور آپ اُس سے کوسوں دُور ہیں۔

ان سینئیرز کے ساتھ جونیئرز کا رویّہ اور حسد بھی دیکھ لیجئے۔کراچی سے پروین شاکر کی ایک ہم جماعت لڑکی مصنّفہ کے گھر آئی۔مصنّفہ نے کہا:

''پروین شاکر، کمال لڑکی ہے۔''

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 165 (1,1)

اُس نے نہایت بے زاری سے جواب دیا:

''آنٹی یہ سب چہرہ الاؤنس ہے۔'' (70)

اس بے زاری بھرے جواب میں جلن اور حسد مل جل کر ٹپک رہا ہے۔ محترمہ فرحت پروین ملک مزید لکھتی ہیں:

''ایک غیر معروف لکھنے والے نے پروین شاکر پر مضمون لکھا (غالباً اُن کا تعلق پشاور کے علاقے سے تھا)۔ کہتے ہیں:

''پاکستانی معاشرے میں پروین شاکر کی شاعری اور وی سی آر کی وجہ سے بے حیائی میں اضافہ ہوا۔'' (71)

فرحت پروین ملک نے اِس بات کی نفی کرتے ہوئے صرف اِتنا لکھا:

''پروین شاکر اور اُس کی شاعری کی وجہ سے لڑکیوں میں انگریزی ادب میں ایم۔اے اور سی۔ایس۔ایس کرنے کا رُجحان اور اپنی بات کہنے کا حوصلہ ہوا۔'' (72)

اور خوشونت سنگھ نے پروین شاکر سے اُس کی شاعری بارے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا:

''معاشرے کے اِس گھٹن زدہ ماحول میں، تم جیسی آزادیٔ نسواں کی جنگ میں حصّہ لینے والی مجاہدہ، نئی نسل کے لیے رول ماڈل ثابت ہوگی اور تمھاری شاعری کا ہر لفظ اُن کے رگ و ریشہ میں ایسے سرایت کر جائے گا کہ اُن کے لیے عملی زندگی میں قیدِ بامشقّت سے رِہائی تک کا سفر آسان اور سہل ہو جائے گا۔

گُڈ شو، پروین کیپ اِٹ اَپ (Keep it up)'' (73)

خوشونت سنگھ کا ''کیپ اِٹ اَپ'' کا مشورہ اپنی جگہ مگر مرد کی حاکمیت کے معاشرے میں یہ عمل جرم ہے۔ ایسا جرم کہ مرنے کے بعد بھی اس کی معافی نہیں ملتی۔ محترمہ رفاقت جاوید لکھتی ہیں کبھی پروین:

''اضطراری کیفیت میں سوچا کرتی تھی کہ لوگ اُسے کس گُناہ کی پاداش میں زندہ درگور کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا اور اپنے ہمراہ اس معاشرے کی ہر اُداس لڑکی کو شامل کر لینا، جن کی کہیں بھی شنوائی نہیں، جرم تو نہیں۔'' (74)

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 166 (1,1)

آہ! اِتنی پڑھی لکھی اور باشعور، معصوم سی لڑکی اِتنا بھی نہیں جانتی کہ یہ کتنا بڑا جُرم ہے۔ مرد کی حاکمیت کے معاشرے میں نسوانی وقار و تحریم اور حقوق کے لیے قلم اُٹھانا سنگین جُرم ہے۔ اِس جُرم کی سزا کے لیے معاشرے نے اس کی ذہانت، شہرت اور شاعری کو بے راہ روی، بدکرداری، بے باکی اور بے حیائی کا نام دے کر اُس کی پاکیزگی کو داغ دار کرنے کے لیے اُس پر کیچڑ اُچھالنے کا ایسا عمل شروع کر رکھا ہے جو اُس کو مارنے کے بعد بھی ختم نہیں ہو رہا۔ بات تھوڑی سی پھیل گئی۔ اصل بات پروین سے حسد اور انتقام کی ہو رہی تھی۔ فرحت پروین ملک نے ایک اور واقعہ بھی لکھا اور کراچی کے اکثر شاعروں کا جو پروین سے حاسدانہ روّیہ تھا، اُس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں کراچی سے ایک شاعر صاحب ملازم تھے۔ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے۔ جس دن ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں زیڈ۔ اے بخاری ہال میں مشاعرہ تھا وہ ہمارے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ اپنے اِدارے کے مشاعرے میں نہیں گئے؟ بھڑک کر بولے:

''میں اُس چھٹانک بھر کی لڑکی کو مشاعرے میں جا کر سُنوں، جو میرے سامنے کراچی میں بڑی ہوئی۔ کراچی ریڈیو میں آیا کرتی تھی۔''

فرحت پروین ملک نے اِس بیان پر یہ تبصرہ کیا ہے:

''جب رشک حسد میں تبدیل ہو جائے تو آدمی اِس قسم کی بات کرتا ہے۔ بہت معذرت کے ساتھ اہلِ کراچی نے اپنی شاعرہ کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا۔'' (75)

گو جس کسی کو بھی موقعہ ملا، اُس نے کیچڑ اُچھالنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی مگر کراچی کے اکثر اہلِ قلم کا نامناسب سلوک زیادہ کھٹکتا ہے۔

اہلِ کراچی کا یہ نامناسب سلوک کیوں تھا؟ طاہر مسعود صاحب نے پروین شاکر پر لکھے خاکے ''خوشبو کی ہجرت'' میں کسی قدر لوگوں اور اپنے ذاتی حسد کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے۔ اِس حوالے سے اُن کے ''خاکے'' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ طاہر مسعود صاحب یونیورسٹی

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 167 (1,1)

میں اپنے زمانۂ طالب علمی کو یاد کر کے اپنے تأثرات بیان کرتے ہیں۔اُن کے زمانۂ طالب علمی سے پہلے پروین شاکر، یونیورسٹی میں اپنی ''خوشبو'' ''کھلار'' کر اور اپنی شاعری کے نقوش چھوڑ کر جا چکی تھیں اور ادب میں اپنا مقام بنانے کے لیے سنجیدگی سے کوشاں تھی اور یونیورسٹی میں طاہر مسعود اور اُن کا حلقۂ احباب اُس کی شاعری پر بحثیں کیا کرتا تھا اور طاہر مسعود کے بقول:

''ہم لوگوں کی ادبی بیٹھکوں میں اُن کا ذکر کبھی عمدگی سے نہ ہوا۔جب بھی ہُوا اُن کی شاعری کی نفی اور اُن کی شاعرانہ صلاحیت سے انکار سے ہوا۔میں محسوس کرتا تھا کہ اس نفی و انکار کے پیچھے رشک وحسد کا خفیف سا جذبہ چُھپا ہے۔۔۔۔قاسمی صاحب کی حوصلہ افزائی بھی بہت سوں کی ناخوشی کا سبب تھی۔'' (76)

مصنّف نے پروین شاکر کی شاعری کی نفی اور شاعرانہ صلاحیت سے انکار کے حوالے سے دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔

1۔ رشک اور حسد کا جذبہ

2۔ قاسمی صاحب کی حوصلہ افزائی اہلِ کراچی کے لیے ناخوشی کا سبب بنی۔ان باتوں کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

پہلے پروین اور قاسمی صاحب کے تعلق اور پھر قاسمی صاحب کی پذیرائی کی بات کرتے ہیں۔ان باتوں کے جائزے کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب کا پروین شاکر کے لکھے خاکے کا مطالعہ مفید اور مددگار رہے گا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب سے پروین شاکر کا تعارف 1971ء میں ہوا، جب پروین ابھی اٹھارہ اُنیس برس کی تھی۔عبیداللہ علیم صاحب نے اُنھیں ''فنون'' میں اشاعت کے لیے پروین کی کچھ غزلیں اور نظمیں ارسال کیں۔اور بقول قاسمی صاحب:

''یہ غزلیں اور نظمیں عنفوانِ شباب کی عشقیہ شاعری کی کامیاب مثالیں تھیں اور پروین کے کلام میں معصوم اور بھرپور محبت کے عجیب مسحور کُن تیور تھے۔'' (77)

چونکہ قاسمی صاحب کو شعر و ادب میں جوہرِ قابل کی ہمیشہ جستجو رہی ہے، اِس لیے اُنھوں

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 168 (1,1)

نے ایک خط کے ذریعے پروین کی ان غزلوں کی تحسین کی اور لکھا: یہ

''یہ غزلیں بہت ہی پیاری اور معیاری ہیں۔''

بس یہیں سے دونوں کے درمیان مراسلت کا آغاز ہوا۔ مراسلت کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور بقول قاسمی صاحب:

''ہمارے درمیان عمّو اور بیٹی کا وہ لازوال رشتہ استوار ہو گیا جو بعض نشیب و فراز کے باوجود اور بعض ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کے باوصف آخر تک قائم رہا۔'' (78)

احمد ندیم قاسمی صاحب کی پروین شاکر سے پہلی ملاقات 1975ء میں کراچی میں ہوئی اور وہ صورت سے اِتنی سادہ اور معصوم لگی کہ قاسمی صاحب اس سادگی اور معصومیت کے تاثر کو آخر تک نہ بھلا سکے اور پھر مراسلت سے تعلق ملاقاتوں تک آن پہنچا اور یہ تعلق اِتنا مستحکم ہوا کہ قاسمی صاحب نے اُسے باقاعدہ بیٹی کا درجہ دے دیا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کے باوجود اس ''لازوال رِشتے'' کو آخر تک قائم رکھا، مگر اُن ''مہربانوں کی منفی کوششوں کی وجہ سے کچھ پریشان ضرور ہوئے۔ ایک جہاں دیدہ باپ کی پدرانہ شفقت کے سبب وہ اپنی اِس سادہ اور معصوم سی مُنہ بولی بیٹی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہے اور اُنھیں ''گھٹیا افراد'' سے محفوظ رکھنے کے لیے عملی قدم اُٹھاتے رہتے تھے۔ اِس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''پہلے میں نے پروین کو گھٹیا قسم کے افراد سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے نہایت عزیز دوست اور بے حد خوب صورت غزل گو اطہر نفیس کو بیٹی کی دیکھ بھال پر مقرر کر رکھا تھا۔ جعفری (اختر حسین جعفری) صاحب کراچی پہنچے تو پروین کو اطہر کے علاوہ ایک اور سہارا مل گیا۔ اِس سلسلے میں پروین نے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے بڑے اطمینان اور آسودگی کا اِظہار کیا تھا۔'' (79)

یہ پروین شاکر کی شادی سے پہلے کے انتظامات ہیں، جب اُسے اپنے والد کا مضبوط سہارا ابھی میسّر تھا مگر مُنہ بولے باپ احمد ندیم قاسمی صاحب کو لاہور بیٹھے اِتنی فکر تھی کہ اس کو ''محفوظ''

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 169 (1,1)

رکھنے کے لیے سہارے فراہم کر رہے تھے۔ کراچی میں یہ ''گھٹیا'' قسم کے لوگ کون تھے؟ اور پروین کو اُن سے کیا خطرات تھے اور اطہر نفیس اور جعفری صاحب ان خطرات سے کیسے نپٹتے اور کیسے دیکھ بھال کرتے رہے، اِس کی وضاحت قاسمی صاحب نے نہیں فرمائی۔ بہرحال ان گھٹیا قسم کے لوگوں اور خطرات سے بچ بچا کر سول سروس اکیڈمی میں ٹریننگ کے لیے پروین شاکر لاہور چلی آئی تو ہر ہفتے کے روز قاسمی صاحب اور منصورہ سے ملنے مجلسِ ترقیِ ادب کے دفتر آیا کرتی تھی۔ وہاں منصورہ اُس کے لیے کھانے کا خاص اہتمام کرتی اور پروین خوب مزے لے لے کر کھاتی اور منصورہ سے اس کی خاصی دوستی ہوگئی مگر پھر بقول قاسمی صاحب:

> ''چند ''مہربانوں'' نے پروین بیٹی کے نہ جانے کیا کیا کان بھرے اور وہ منصورہ سے بظاہر کھچی کھچی سی رہنے لگی۔۔۔۔۔اس سب کے باوجود میری فراخ دل بیٹی منصورہ نے پروین کی آمد پر اُس کی پذیرائی اور مدارات میں کوئی کمی نہ آنے دی۔'' (80)

اِس اقتباس سے دو تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو قارئین کو خبر ہوتی ہے کہ ''مہربانوں'' کی منفی کوششوں کا سلسلہ کہاں تک دراز تھا۔ یعنی صرف کراچی ہی نہیں بلکہ لاہور میں بھی ایسے ''مہربان'' موجود تھے جو باپ بیٹی کے لازوال رشتے میں رخنے ڈالنے کے لیے کوشش اور جتن کرتے رہے۔ دوسرا دونوں بیٹیوں کے مزاج اور رویّے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک بیٹی کھانے کا خاص اہتمام کرتی ہے اور دوسری مزے لے لے کر کھاتی ہے، مگر پھر بھی کھچی کھچی رہتی ہے۔ یعنی ایک بیٹی فراخ دل ہے اور دوسری کانوں کی کچی ہے۔ اِس کے باوجود کانوں کی اِس کچی بیٹی سے باپ کی محبت اور رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

قاسمی صاحب نے ''خوشبو'' سے لے کر ''ماہِ تمام'' تک تمام کتابوں کی اشاعت کا بھی اِس خاکے میں ذکر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہاجرہ بہن کے گھر میں بیٹھ کر ہم باپ بیٹی نے ''خوشبو'' کے مسوّدے پر نظر ڈالی۔ اِس ضمن میں بہت دلچسپ بحثیں ہوئیں۔ جب میں اپنی سینیارٹی اور تجربہ کاری کے زعم میں اُس کے بعض شعروں اور نظموں کو رد کر دیتا تو وہ مجھ سے خاصا زوردار مکالمہ

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 170 (1,1)

کرتی۔'' (81)

اِس تجربہ کاری اور مکالمے ہی کا نتیجہ تھا کہ ''خوشبو'' ناقابل یقین حد تک مقبول ہوئی۔

''صد برگ'' کی اشاعت کا اہتمام بھی ''خوشبو'' کی اشاعت کی طرح قاسمی صاحب ہی کو کرنا تھا، سو اُنھوں نے اِس مجموعے کی کتابت بھی کرائی مگر:

> ''بیٹی کو اُس کے خیال میں ایک بہتر ناشر مل گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس ناشر نے بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔''(82)

''خود کلامی'' کی اشاعت کے سلسلے میں ''بیٹی'' نے قاسمی صاحب سے صرف نام کی منظوری لی اور قاسمی صاحب نے بھی کچھ سوچے بغیر پسندیدگی کا اِظہار کر دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب میں کچھ کمزور شاعری بھی شامل ہوگئی۔ ''انکار'' کا مسوّدہ قاسمی صاحب کی نظر سے ضرور گزرا اور اس میں شامل ''نثری نظموں'' پر اُنھوں نے اعتراض بھی کیا، مگر پروین کی ضد کا لحاظ کرتے ہوئے یہ نثری نظمیں رہنے دیں۔

''ماہِ تمام'' کی اشاعت تک تو بیٹی نے قاسمی صاحب کو خبر تک نہیں ہونے دی اور نام تک کی بھی منظوری نہ لی گئی۔ اِس لیے نام پر قاسمی صاحب اور منصورہ نے مشترکہ اعتراض کیا کہ ''ماہِ تمام'' تو چاند کے زوال کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ بہر حال ''کُلیات'' کے چھپنے پر گو مسرّت کا اظہار فرمایا مگر بین السّطور ایک گِلے اور شکایت کا بھی تأثر موجود ہے۔

شوہر سے علیحدگی کے بعد پروین شاکر کی زندگی میں ایک تلاطم برپا تھا اور وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے کے ساتھ اسلام آباد جیسے شہر میں تنہا بڑی کرب ناک زندگی گزار رہی تھی (اور یہاں قاسمی صاحب نے اُس کی حفاظت اور گھٹیا لوگوں سے بچانے کے لیے کوئی انتظام بھی نہیں کیا تھا)۔ قاسمی صاحب نے پروین کی زندگی کے ان مسائل کو نظر انداز کر کے، پروین کی خودسری، گوشہ نشینی اور بے رُخی کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے۔ یونیورسٹی کی چند طالبات سے اُس کی بے اعتنائی، رُوکھے پن کے رویّے اور غلط برتاؤ کے خلاف قاسمی صاحب نے احتجاج بھی کیا اور سخت لہجے کا خط بھی لکھا۔ بیٹی نے جب اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا تو گو قاسمی صاحب نے خود اپنے ہاتھ

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 171 (1,1)

سے وہ خط پھاڑ کر پھینک دیا ،مگر ’’خاکے‘‘ میں اس واقعے کا ذکر ضروری سمجھا۔ یعنی اس رویّے کو بھول نہیں پائے۔ اپنی ذہنی کیفیت بیان کرنے کے بعد بیٹی نے فکرمند باپ سے ہاتھ ملا کر یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ منصورہ کو لے کر اُس کے پاس اسلام آباد آئیں گے۔ وعدے کے باوجود فکرمند باپ کو اسلام آباد جانے کی فُرصت میسّر نہ آسکی۔

خاکے میں قاسمی صاحب نے اپنے ایک ذاتی دُکھ کا بھی اِظہار کیا ہے جو اُن کی زندگی کے آخری دِنوں میں اُداسی کا سبب بنا۔ اسلام آباد میں اہلِ قلم کانفرنس تھی۔ اکادمی ادبیات کے فاؤنڈگ فیلو اور گورننگ باڈی کے رُکن ہونے کے باوجود قاسمی صاحب کو اِس کانفرنس میں نہیں بلایا جارہا تھا۔ گو قاسمی صاحب نے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو بھی اِس کانفرنس میں شمولیت سے منع نہیں کیا تھا مگر بقول قاسمی صاحب:

> ’’میرے اندر دوستی اور محبت کا پندار بے دار رہا جو یہ کہتا رہا کہ میرے فلاں فلاں دوست اور خاص طور سے میری بیٹی تو اِس کانفرنس میں شرکت سے انکار کردے گی۔۔۔مگر وہ اس میں شامل ہوئی اور مجھے اس کا دُکھ ہوا۔‘‘(83)

اور قاسمی صاحب نے اپنے اِس دُکھ کا اظہار خط کے ذریعے کیا اور پروین شاکر کو لکھا:

> ’’بیٹی کانفرنس میں تمھاری شمولیت سے مجھے منصور حلاّج یاد آرہا ہے، جو لوگوں کے پتھر کھا رہا تھا مگر چپ تھا، جب اُس کے ایک اپنے نے اُس پر ایک پھول، پتھر کی طرح پھینکا تو وہ بلک اُٹھا۔‘‘(84)

قاسمی صاحب تو اِدھر بلکتے رہے مگر بیٹی نے خط کا جواب تک نہ دیا۔ اس کے باوجود قاسمی صاحب نے:

> ’’بیٹی کی سال گرہ (24 نومبر،1994ء) پر اُسے فون کر کے مبارک باد دی مگر اُس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے یا رونے پر ضبط کر رہی ہے۔۔۔ میں نے کہا بیٹی یہ غلط ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ میں نے اُسے سنبھلنے اور اپنی حفاظت کرنے کو کہا مگر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اُس کی آواز نے بے چین کر دیا۔‘‘(85)

ایک روتی ہوئی بیٹی کا بے چین باپ فوری طور پر تو اُس کے آنسو پونچھنے اسلام آباد نہ جا

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 172 (1,1)

سکا، البتہ مسقط سے واپسی پر جانے کا پروگرام ضرور ترتیب دیتا رہا۔ یہ پروگرام بنتا ہی رہ گیا اور غم زدہ بیٹی اپنی بھیگی پلکوں سمیت اِس دُنیا سے رُخصت ہوگئی۔

قاسمی صاحب کی اِس تحریر سے پروین شاکر کی جو تصویر اُبھری ہے، وہ ایک ذہین، سادہ، معصوم، خوب صورت مگر ضدّی، خودسر، کانوں کی کچی، باپ سے اُلجھتی، بے کار بحثیں کرتی، اُس کے پندار کو ٹھیس پہنچاتی اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی، تنہائی کا کرب برداشت کرتی ایسی لڑکی ہے جس نے ادب کی دُنیا میں شہرت پائی مگر نجی زندگی میں تنہائی، اُداسی اور ناکامی اُس کا مقدر رہی اور ''باپ'' کی شفقت، ہمدردی اور بے چینی بھی جس کا مداوا نہ کر سکی۔

قاسمی صاحب کے اِس خاکے میں دردمند دل رکھنے والے باپ کی شفقت کے ساتھ ساتھ بہت سے گلے شِکوے بھی ہیں۔ ایسے گِلے شکوے جنھیں قاسمی صاحب پروین شاکر کی موت کے بعد بھی بُھلا نہیں سکے۔

پروین شاکر نے بھی عجیب قسمت پائی تھی۔ ایک طرف عمّو جان ہیں جن کے گِلے شِکوے اُس کی موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوئے اور دوسری جانب کراچی کے کچھ شاعر اور ادیب ہیں جو قاسمی صاحب کی پذیرائی سے ناخوش ہیں۔

قاسمی صاحب نے جو پروین شاکر کی پذیرائی کی اور اُن دونوں کے مابین جو لازوال رشتہ قائم تھا، اور جس میں کچھ مہربان بار بار رخنے ڈالنے کی کوشش کرتے رہے اور قاسمی صاحب کی پدرانہ شفقت اور شکوے شکایت کے بارے تو اُوپر کے صفحات میں کچھ ذکر ہوا ہے۔ اب گھوم پھر کے جناب طاہر مسعود صاحب کے خاکے کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ کراچی کے ادیب اور شاعر پروین کی شاعری اور شاعرانہ صلاحیت سے جو انکار کرتے ہیں اُس کے پیچھے رشک وحسد کا خفیف سا جذبہ چُھپا ہے۔

طاہر مسعود نے رشک کا ذکر تو شاید محاورتاً کر دیا ہے، کیونکہ رشک کی بجائے حسد کا جذبہ، اور وہ بھی خفیف سا نہیں بہت زیادہ دِکھائی دیتا ہے۔ طاہر مسعود کے لکھے ہوئے خاکے ''خوشبو کی

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 173 (1,1)

ہجرت‘‘ میں بھی حسد، انتقام کی حدوں کو چھوتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔

طاہر مسعود صاحب کے ادبی گروپ کے نزدیک وہ ایک روایتی سی شاعرہ ہے جو متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے رومانی جذبات کی ترجمان ہے اور بس۔ اِس گروپ کے سرخیل قمر جمیل صاحب بھی جدیدیت کی رَو میں پروین شاکر کی شاعری بارے کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے تو پھر بقول طاہر مسعود:

’’جب ادب کے گاڈ فادر ہی سے سند نہ ملی ہو تو پروین شاکر، گاڈ فادر کی اُمّت یا حواریوں میں کیسے پسندیدہ اور اہم ٹھہرتیں۔‘‘(86)

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طاہر مسعود اور دیگر حواری، جنھوں نے پروین شاکر کے کلام کو پڑھا تک نہیں تھا، اُس کی شاعری کو شدّومد سے مسترد کرنے کی صدائیں سُن کر متاثر ہو چکے تھے۔ مگر ایک روز اسی گروپ کے ایک ممبر محمود کنور نے مصنّف سے کہا:

’’یہ جو لوگ پروین کی شاعری کو سنجیدگی سے لینے کو تیار نہیں یہ اُس جیسا ایک مصرع تو کہہ کر دِکھائیں۔‘‘(87)

محمود کنور صاحب نے تو قمر جمیل اور اُن کے حواریوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے اور اُن کے حسد کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔

اپنے ادبی مربی محمود کنور کی پروین شاکر کی شاعری بارے تعریف و توصیف کے کلمات سُن کر مصنّف بھی یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

’’پروین شاکر کی شاعری سے بے التفاتی جدیدیت زدہ حلقوں میں یقیناً غیر ادبی وجوہ کی بنا پر ہے، ورنہ اُن کی شاعری بابت یہ رائے کہ پروین شاکر نے اُردو شاعری کو نِسائی لمس سے آشنا کیا ہے، بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔‘‘(88)

مصنّف کو اپنی مربی کی باتیں سُن کر بھی پروین شاکر کی شاعری میں صرف ’’نسائی لمس‘‘ ہی دِکھائی دیا ہے۔ شاید مرد کی آنکھ اس سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی یا وہ دانستہ طور پر اپنے آپ کو یہاں تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے کہ اس میں بہر حال ایک لذّت کا پہلو تو موجود ہے۔

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 174 (1,1)

مصنّف کے نزدیک ''خوشبو'' کا منظرِ عام پر آنا، شہر کراچی کی ادبی زندگی کا ایک قابل ذکر واقعہ تھا، اور پھر ''خوشبو'' کی تقریبِ رُونمائی آرٹس کونسل کراچی میں ہوئی اور بڑی دُھوم دھام سے ہوئی۔ اور بقول مصنّف:

''پروین شاکر کی مقبولیت کے ادبی طیارے نے یہیں سے ٹیک آف کیا اور اُونچے آسمانوں کی طرف اُڑتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ کراچی کے ادیبوں شاعروں کی رسائی سے بھی باہر ہوگئیں۔''(89)

کراچی کے ادیب شاعر، خاص طور پر نثری نظم سے متأثر نوجوان شاعر جنھوں نے ''خوشبو'' کو ''ہونہہ، یہ رومانی شاعری'' کہہ کر جھٹک دیا تھا اب اُنھیں اِس بات کی شکایت تھی کہ پروین نے اِتنی اُونچی اُڑان کیوں بھری ہے؟ اُن کی رسائی سے باہر کیوں اور کیسے ہوگئی؟ اُن کے حلقے تک محدود کیوں نہیں رہی؟ پروین شاکر اُن کے حلقے سے آزاد اور اُن کی رسائی سے باہر ہو کر شہرت کی آخری حدوں کو چُھو رہی تھی۔ جلنے اور حسد کرنے کے لیے یہ سب بہت کچھ تھا۔ اور پروین کی اب صرف اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی اُس کی زبردست پذیرائی ہو رہی تھی اور مصنّف کے مطابق:

''پروین شاکر نے ادبی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے لیے بھارت کا سفر اختیار کیا۔ وہاں اُن کا سواگت قرۃ العین حیدر نے یہ کہہ کر کیا کہ:

''ارے لڑکی اِتنی چھوٹی سی ہو کر تُو نے اتنا سارا ''اچھا کام کیسے کر دیا۔''(90)

قرۃ العین حیدر نے پروین شاکر کے حُسن کی نہیں بلکہ ''اچھے'' کام کی تعریف کی تھی۔ بھارت سے واپس آ کر پروین شاکر رسالہ ''عقاب'' (جسے اُس وقت طاہر مسعود بھی جوائن کر چکے تھے) میں اپنی پذیرائی کی داستان ''امن کے سترہ دن'' کے عنوان سے قسط وار لکھنے لگی اور طاہر مسعود صاحب اِس سفرنامے کو بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے، کیونکہ اس میں بقول اُن کے:

''میری محبوب مصنّفہ کا تذکرہ خاصہ تھا۔''

مگر مطالعہ کے دوران اُن کو جو چیز کھٹکی وہ پروین کی نرگسیت اور خود پسندی تھی۔ اپنی

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 175 (1,1)

اہمیت کا جا بجا احساس تھا۔ مصنّف کو گِلہ تھا کہ:

''عینی آپا کے جذبہَ دلداری و اِنکسار و محبت کو اُن کی خود پسندی اور نرگسیت نے کچھ اور ہی معنی پہنا دیے ہیں۔''(91)

مصنّف اُس وقت تک بڑی کوفت اور اذیّت میں رہے جب تک انتظار حسین صاحب بھارت جا کر عینی آپا سے نہیں ملے اور واپس آ کر یہ نہیں لکھا کہ:

''عینی کہتی ہیں، پچھلے دِنوں پاکستان سے ایک ''چھوکری'' پروین شاکر آئی تھی۔ اُس سے میں اچھے سے ملی۔ اُس نے واپس جا کر جانے کیا کیا اُلٹی سیدھی باتیں میرے بارے میں لکھ دیں۔''(92)

مصنّف کے مطابق عینی آپا کو غصّہ ''عقاب'' میں چھپے سفر نامہ میں موجود اُلٹی سیدھی باتوں پر ہی نہ تھا بلکہ اِس بات پر بھی تھا کہ:

''پروین نے اُن پر ایک نظم بھی لکھ ماری تھی۔ نظم میں عینی کا تاَثر تنہائی اور اُداسی میں گھلتی ہوئی ایک عورت کا اُبھرتا تھا۔''(93)

مصنّف کا بیان اور انداز اُن کے اندر کی کوفت اور اذیّت کا کھلم کھلا اظہار اور اُن کے ذہن کی کسی خلش کی چغلی کھاتا ہے۔

عینی سے پروین شاکر کی ملاقات اور اس ملاقات بارے اُس کے تاَثرات کو رفاقت جاوید نے بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''پروین شاکر جیسی حسّاس لڑکی نے قرۃ العین حیدر جیسی جہاں دیدہ عورت کی تنہائی، کرب اور پھر چڑچڑے پن کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ عورت کو ہر صورت اور ہر حال میں ایک بار شادی کرنے کا فیصلہ ضرور کرنا چاہیے۔''(94)

اور قرۃ العین حیدر کے لیے لکھی نظم میں بھی ایسی کیفیت کا تذکرہ ہے:

''جیون زہر کو متھ کر امرت نکالنے والی موہنی
بھرا پیالہ ہاتھوں میں لیے، پیاسی بیٹھی ہے
وقت کا راہو گھونٹ گھونٹ بھرے جاتا ہے

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 176 (1,1)

''دیوی'' بے بس دیکھ رہی ہے
پیاس سے بے کل ہے اور چُپ ہے''

نظم ''قرۃ العین حیدرؔ'' سے اقتباس (صد برگ)

(مزید تفصیل محترمہ رفاقت جاوید کی مذکورہ کتاب اور مکمل نظم پروین شاکر کی ''صد برگ'' میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

محترم طاہر مسعود صاحب کو پروین شاکر کی نرگسیت اور خود پسندی تو بہت کھٹکتی ہے مگر اپنی محبوب مصنّفہ ''عینی'' کی تنہائی، اُداسی اور پھر اندازِ تفاخر دِکھائی نہیں دیتا۔ عینی آپا بلاشبہ ایک بڑی مصنّفہ ہیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں۔ اگر اُن کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے احساسات اور جذبات کو خوب صورت انداز میں نظم کیا تھا تو عینی آپا کو بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے قبول کرنا چاہیے تھا۔ مگر بڑے لوگوں میں یہ چھوٹا پن نہ جانے کہاں چُھپا ہوتا ہے جو جونیئرز کو ڈانٹنے ڈپٹنے کے لیے وقتاً فوقتاً باہر چھلک پڑتا ہے۔ اِس سے جونیئرز پر تو جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے مگر اُن کے بڑے پن کو بھی ٹھیس لگتی ہے۔ کاش عینی آپا نے کم ظرفی کی بجائے بڑے پن کا مظاہرہ کیا ہوتا اور پروین شاکر کا اگر شکریہ نہیں تو کم از کم حوصلہ افزائی کی ہوتی۔

طاہر مسعود صاحب نے بھی صرف عینی آپا کی ڈانٹ ڈپٹ ہی نہیں بلکہ یہ لکھ کر اپنے دل کی بھی بھڑاس نکالی ہے۔ پروین شاکر سے طاہر مسعود صاحب کو جو غصّہ ہے وہ صرف عینی آپا والے معاملے ہی سے نہیں بلکہ اُس کا سبب کچھ اور ہے اس کا اظہار اُنھوں نے خود کیا ہے۔ اِس کا پتہ اُس ''ادبی عدالت'' کی رُوداد سے لگتا ہے جو یونیورسٹی میں طلباء یونین نے لگائی تھی۔ اُس ادبی عدالت میں استغاثہ کے وکیل حسین حقانی اور طاہر مسعود صاحب تھے اور گوشمالی کے لیے اِبن صفی اور پروین شاکر کو بلایا گیا تھا۔ مصنّف نے سب سے پہلے تو اِس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ وہ یونیورسٹی میں ایک مہمان کی حیثیت سے آئی ہیں، اُس کے گیٹ اپ اور لباس پر اپنے تحفّظات کا اِظہار کیا ہے:

''پروین شاکر پنڈال میں داخل ہوئیں تو ایک لمحے کے لیے تو میں اُنھیں پہچان ہی

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 177 (1,1)

نہ سکا۔گہرے میک اپ اور زرق برق ساڑھی میں ملبوس، جب سج سج چلتی ، اسٹیج کی سیڑھیاں اُنھوں نے عبور کیں تو میں سرکو دوپٹے میں چھپائے سادہ سے کپڑوں میں اُس پروین کو ڈھونڈتا اور یاد کرتا رہ گیا جسے (برسوں پہلے) میں نے بندر روڈ کی پُرہجوم سڑک پر ایک پُرانے سے سال خوردہ رکشے پر سوار کرایا تھا۔وقت کیا سے کیا کرتا ہے آدمی کو۔''(95)

سر ڈھانپے ، سادہ کپڑوں میں ملبوس اور سال خوردہ رکشے میں سوار ہونے والی پروین کو وقت نے کیا سے کیا کر دیا ہے؟ یونیورسٹی کے پروگرام میں شرکت کے لیے اُسی سال خوردہ رکشے میں بیٹھ کر سادہ کپڑوں میں کیوں نہیں آئی ؟ مصنف کے لیے کہ بات کسی صدمے سے کم نہیں ۔جب اعتراض کرنا ہی پیشِ نظر ہو تو پھر وقت کے ساتھ ایسی تبدیلی کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔پروین شاکر کو اس ظاہری ہیئت میں دیکھ کر اور ذہنی صدمے سے دو چار ہونے کے بعد وکیل استغاثہ طاہر مسعود صاحب نے پروین شاکر پر جرح شروع کی تو وہ تلخی کا شکار ہو گئی اور طاہر مسعود صاحب کے بقول:

''وہ تلخ ہونے میں حق بجانب تھی کہ میری جرح کا سوال ہی احمقانہ تھا۔''(96)

اگر کوئی شخص اپنی حماقت کا خود ہی اعتراف کر رہا ہو تو اس پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ہم تو صرف یہ عرض کریں گے کہ وکیل استغاثہ کی ''حسد'' نے مت مار کر رکھ دی ہے ۔وہ دوستوں کی مشاورت سے سوال مرتّب کرتے ہیں اور سوال کی نوعیت پر غور کیے بغیر ہی پوچھتے ہیں:

''آپ نے شعری مجموعے کا نام ''خوشبو'' کیوں رکھا؟ بدبو کیوں نہ رکھا؟''(97)

ایسا سوال کر کے پھر گِلہ کرتے ہیں کہ پروین تو تلملا اُٹھیں اور کوئی سخت سا جواب دیا۔اب یہ بھی کمال ہے کہ اپنا سوال یاد ہے مگر اُس کا جواب یاد نہیں ۔اخلاق کا تقاضا تھا کہ وہ جواب بھی لکھا جاتا۔اس سوال و جواب کو یہیں چھوڑ کر مصنّف اگلا سوال داغتے ہیں ۔مصنّف کا اگلا سوال پروین شاکر کی نظم ''ضِد'' کے حوالے سے ہے ۔مصنّف نے یہ نظم اس خاکے میں درج

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 178 (1,1)

نہیں کی، صرف سوال ہی کا ذکر کیا ہے۔ ہم قارئین کے لیے پہلے نظم درج کرتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہیں۔

نظم

''ضد''

میں کیوں اُس کو فون کروں
اُس کے بھی تو علم میں ہوگا
کل شب
موسم کی پہلی بارش تھی

مصنّف بیان کرتے ہیں:

''میں نے اُن کی ایک نظم سنا کر، جس میں غالباً محبوبہ فریق ثانی سے اِس بات پر اظہارِ افسوس کرتی ہے کہ آہ! میں تمھیں بتا نہ سکی کہ کل موسم کی پہلی بارش تھی، یہ جرح کی کہ محترمہ، یہ فرمائیے اِتنی اہم اطلاع دینے میں کیا امر مانع تھا؟'' (98)

اب قارئین خود فیصلہ کریں کیا یہ سوال بنتا ہے؟ نظم میں افسوس کا اظہار کہاں ہے؟ محبوبہ نے یہ اطلاع دینے کی ضرورت ہی کب محسوس کی جو کوئی امر مانع ہوتا؟ نظم میں تو ایک مشرقی لڑکی کے کومل جذبے، اَنا اور پس پردہ شرم و حیا چھپی ہے۔ بہر حال مصنّف نے اپنی دانست کے مطابق یہ سوال اُٹھایا تو مصنّف کے بقول:

''پروین تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی، غصّے میں کہا'' آپ ابھی بچے ہیں، ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے۔'' (99)

اِس جواب کا کیا ردِ عمل ہوا؟ مصنّف بیان کرتے ہیں:

''کسی جوان اور حسین خاتون کی طرف سے ایک نوجوان کو یہ طعنہ دینا بڑی ہزیمت اور شرمندگی کی بات تھی۔ طلباء و طالبات نے بھی اِس جواب پر خوب شور مچایا اور کافی دِنوں تک یہ طعنہ احباب میں موضوعِ گفتگو اور میرے دل میں برچھی بن کر ترازو رہا۔'' (100)

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 179 (1,1)

مصنف نے یہ کہا ہے کہ ”کافی دِنوں تک یہ طعنہ دل میں برچھی بن کر ترازو رہا۔“ مگر لگتا یوں ہے کہ یہ برچھی ابھی تک دل میں اٹکی ہوئی ہے اور وہ ابھی تک اس ہزیمت اور شرمندگی کو بھول نہیں سکے۔ اِس ہزیمت کے علاوہ مصنّف کو اِس بات پر بھی گِلہ اور شکایت ہے کہ پروین شاکر نے اُن کے کہنے پر اُنھیں ”روزنامہ جسارت“ کے لیے انٹرویو نہیں دیا تھا۔ انٹرویو دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اِس کا سبب تو مصنّف نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اخبار میں مشفق خواجہ (خامہ بگوش) کے کچھ ایسے کالم چھپے تھے جو احمد ندیم قاسمی کے لیے خاصی دل گرفتگی کا باعث بنے تھے اور مصنّف نے اِسی بنیاد پر انکار کرتے ہوئے پروین شاکر کا موقف لکھا تھا:

> ”جسارت“ اخبار کے لیے تو میں ہرگز انٹرویو نہیں دے سکتی۔ اس میں جو کچھ (عمّو جان) قاسمی صاحب کے بارے میں چھپتا رہا ہے اُس کے بعد آپ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ میں اس اخبار کے لیے انٹرویو دینے پر آمادہ ہو جاؤں گی۔“(101)

اِس وفاداری اور تعلق پر موصوفہ کی تعریف و تحسین کی بجائے مصنّف کو یہ انکار انتہائی ناگوار گزرا جس کا اِظہار یوں کیا:

> ”خامہ بگوش کے کالم کی وجہ سے پورے ادبی صفحہ سے بے زاری کیوں؟ اگر ایسی ہی بے زاری ہے تو اس کا اِظہار کر سکتی تھیں۔۔۔۔ میں قائل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ ”جیسی آپ کی مرضی۔“(102)

پروین شاکر کی مرضی تو یہاں ختم ہوگئی اور مصنّف کی مرضی بلکہ کسی حد تک انتقام کا آغاز ہوا۔ اب مصنّف کو پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ:

> ”پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں سرخرو ہو کر اپنے لیے ایک ایسے محکمے کو ترجیح دی جو کم از کم شاعرہ کی طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے اَن مِل اور بے جوڑ تھا مگر دُنیا میں کامیابی، ترقی اور تموّل کے لیے شاندار تھا۔“(103)

ہر شخص کو زندگی میں اپنے فیصلے کرنے کا حق ہے۔ اس کے لیے کیا بہتر ہے، کیا بہتر نہیں ہے، وہ خود زیادہ بہتر جانتا ہے۔ کوئی پیشہ یا ملازمت اُس کے مزاج اور شوق سے جوڑ رکھتا

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 180 (1,1)

ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ اُس نے خود کرنا ہے۔ اور پھر، کیا دُنیا میں کامیابی حاصل کرنا اور ترقی کرنا بھی جرم ہے؟ کیا اِس کے لیے بھی دوسروں سے اجازت حاصل کرنا اور اُن کی مرضی سے فیصلے کرنا ضروری ہے؟

پروین شاکر سے شاید یہی جرم سرزد ہوا کہ اُس نے فیصلے کرتے ہوئے دوسروں کی مرضی کا خیال نہیں رکھا۔ اور اُس کا یہ جرم ناقابل معافی ٹھہرا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، بلکہ مصنّف نے یہاں تک لکھا ہے کہ دُنیا میں کامیابی اور بہتر کیریئر کی دوڑ دوڑتے ہوئے ازدواجی رشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئی اور اس پر وہ مطمئن بھی رہی کہ خسارے کا سودا نہیں کیا۔

مصنّف کے اِس بیان پر پچھلے صفحات میں بھی بات ہو چکی ہے اِس لیے اسے دُہرانا تو مناسب نہیں، صرف اِتنا عرض کرنا ہے کہ طلاق عورت کی زندگی میں کیا زہر گھولتی ہے اور علیحدگی اُس کی زندگی کا کتنا بڑا روگ اور عذاب بن جاتی ہے۔ مرد اِس عذاب کی شِدّت سے واقف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر وہ مرد جس کے دل میں طعنہ برچھی بن کر ترازو ہو وہ تو یہی لکھے گا کہ وہ مطمئن تھی اور سمجھتی تھی کہ اُس نے خسارے کا سودا نہیں کیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس خاکے میں انصاف نہیں بلکہ حسد اور انتقام کی چنگاریاں سُلگتی نظر آئی ہیں۔ ایک خاتون جو اِس دُنیا سے کُوچ کر چکی ہو، بلا تحقیق اس پر کیریئر کی دوڑ میں شرکت اور دُنیاوی کامیابی کے لیے خاوند سے علیحدگی، رشتوں کے تقدّس اور سماجی زندگی کے تقاضوں کی نفی کا الزام تھوپ دینے سے ممکن ہے اپنی کوفت اور اذیت میں کمی آنے کی توقع اور امکان ہو اور دل میں جو برچھی ترازو ہوئی تھی اُس کی کسک سے افاقہ نصیب ہونے کا کوئی پہلو ہو، وگرنہ یہ مشرقی روایات کی سراسر نفی اور اہلِ کراچی کے حسد کی کہانی ہے۔

یہ خاکہ مرد شاونزم کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور پتہ نہیں مرد کو اِس پر فخر کرنا چاہیے یا شرمندہ ہونا چاہیے۔

اب یہاں پھر فرحت پروین ملک کی جانب رجوع کرتے ہوئے اُن کا جُملہ پھر

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 181 (1,1)

دُہراتے ہیں کہ جب حسد حد سے بڑھ جائے تو پھر آدمی اس قسم کی ہی باتیں کرتا ہے۔افسوس ہے کہ اہلِ کراچی نے اپنی شاعرہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

محترمہ فرحت پروین ملک نے خاکے کے آخر میں بڑے دُکھ سے لکھا ہے کہ زندگی میں ادبی بھیڑیے اُسے کھانے پر تُلے ہوئے تھے اور وفات کے بعد:

''جو کچھ سُنا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔جن لوگوں نے کبھی اُس کا ڈرائنگ روم بھی نہیں دیکھا ہوگا وہ اُس کے بیڈ روم کی بات کرتے ہیں۔''(104)

اُف! یہ ادبی بھیڑیے،
آہ! پروین شاکر
جسے مارنے کے بعد بھی سزا کا عمل جاری ہے۔

آخر میں پروین شاکر کی نظم ''دل چاہتا ہے'' سے ایک اقتباس:

بہت دل چاہتا ہے
کسی دن ''مہربانوں''(1) کے نام لکھوں ایک کُھلا خط
کہ تم نے چور دروازے سے آکر
میرے گھر کا تقدّس
''کس''(2) طرح پامال کر کے
توشہ خانے کو تصرّف میں لیا ہے''

آہ! پروین شاکر جو اَب ایسا خط بھی نہیں لکھ سکتی اور ''مہربانوں'' کو اُس کا دامن داغ دار کرنے اور اُس کے گھر کا تقدّس پامال کرنے کی کھلی اجازت ہے۔

❁❁❁❁❁❁

اصل الفاظ

(1) ''غاصبوں''

(2) جس

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 182 (1,1)

حواشی

1۔ عرفانہ عزیز، مضمون ''میری پروین''، لاہور، روزنامہ جنگ، 2 جنوری 1995ء

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً

5۔ ایضاً

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 183 (1,1)

6۔ ایضاً

7۔ ایضاً

8۔ زاہد حسین بھٹی، کاندھے پہ دھرے ساز، لاہور، غالب نما، 1998ء، بیان، احمد جاوید، ص31

9۔ ایضاً، بیان اقبال فریدی، ص33

10۔ کشور ناہید، مٹھی بھریادیں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2015ء، ص126

11۔ ایضاً، ص127

12۔ ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک، خاکہ نگری، کراچی، اکادمی بازیافت، 2002ء، 151

13۔ ایضاً، ص 149

14۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سُندر بن، کراچی، میڈیا گرافکس، دربارِ ادب، 2022، ص53

15۔ احمد پراچہ، ''پروین شاکر احوال وآثار''، لاہور، علم وعرفان پبلشرز، 2003ء، ص4

16۔ ایضاً، ص 4

17۔ ایضاً، ص 32

18۔ ایضاً، ص 32

19۔ ایضاً، ص 33

20۔ ایضاً، ص 33

21۔ عرفان جاوید، سرخاب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2020ء، ص26، 27

22۔ عالیہ جلیل شاہ، تنہا چاند، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1997ء، 32

23۔ عالیہ جلیل شاہ، تنہا چاند، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1997ء، 32

24۔ ایضاً، ص 32

25۔ رفاقت جاوید، ''پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا، اسلام آباد، پروین شاکر ٹرسٹ، 2014ء
ص 129

26۔ احمد پراچہ، پروین شاکر، احوال وآثار، ص34

27۔ نجمہ خانم ملک، ''پروین شاکر، سوانحی خاکہ ودیگر مضامین''، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، س۔ن
ص14، 15

28۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سُندر بن، ص55

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 184 (1,1)

29۔ زاہد حسین بھٹی، کاندھے پہ دھرے ساز، ص34،35،60
30۔ احمد پراچہ، پروین شاکر، احوال و آثار، ص34
31۔ عرفان جاوید، سرخاب، ص26،27
32۔ رفاقت جاوید ''پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا''، ص99
33۔ عرفان جاوید، سرخاب، ص27
34۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007ء، ص121
35۔ نجمہ خانم ملک ''پروین شاکر، سوانحی خاکہ و دیگر مضامین''، ص18
36۔ ایضاً، ص18
37۔ عرفان جاوید، سرخاب، ص28
38۔ ایضاً، ص28
39۔ ایضاً، ص29
40۔ رفاقت جاوید ''پروین شاکر جیسا میں نے دیکھا''، ص100
41۔ ایضاً، ص176
42۔ سرفراز اقبال، خاکہ ''دُکھی عورت، پروین شاکر''، مشمولہ ''نسوانی خاکے'' مرتبہ شاہد حنائی، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، 2015ء، ص92
43۔ فرحت پروین ملک ''یادوں کا سُندر بن''، ص43
44۔ ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک، خاکہ نگری، ص151
45۔ عرفان جاوید، سرخاب، ص32
46۔ نجمہ خانم ملک، پروین شاکر، سوانحی خاکہ و دیگر مضامین، ص28
47۔ ایضاً، ص35
48۔ عرفان جاوید، سرخاب، ص40
49۔ رفاقت جاوید، پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا، ص151
50۔ ممتاز مفتی، اوکھے اولڑے، لاہور، فیروز سنز، 1995ء، ص40،41
51۔ طاہر مسعود، خاکہ بعنوان ''خوشبو کی ہجرت، مشمولہ کتابی سلسلہ ''ادبِ عالیہ۔2، کراچی، ادبِ عالیہ پبلی کیشنز، مارچ 2017ء، ص112

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 185 (1,1)

52۔ ایضاً، ص106
53۔ رفاقت جاوید، پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا، ص107
54۔ ایضاً، ص150
55۔ ایضاً، ص195
56۔ ایضاً، ص194
57۔ سرفراز اقبال، پروین شاکر، دُکھی عورت، ص93
58۔ ایضاً، ص93
59۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سندربن، ص57
60۔ رفاقت جاوید، پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا، ص114
61۔ نجمہ خانم ملک، پروین شاکر، سوانحی خاکہ و دیگر مضامین، ص34
62۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سندربن، ص53
63۔ ایضاً، ص56
64۔ ایضاً، ص45
65۔ ایضاً، ص 46
66۔ ایضاً، ص46
67۔ ایضاً، ص46
68۔ ایضاً، ص49
69۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سندربن، ص41
70۔ ایضاً، ص41
71۔ ایضاً، ص54
72۔ ایضاً، ص54
73۔ رفاقت جاوید، پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا، ص53
74۔ ایضاً، ص115
75۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سندربن، ص56
76۔ طاہر مسعود، خوشبو کی ہجرت، ص107

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 186 (1,1)

77۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، ص118
78۔ ایضاً، ص119
79۔ ایضاً، ص32
80۔ ایضاً، ص123
81۔ ایضاً، ص119
82۔ ایضاً، ص123
83۔ ایضاً، ص127
84۔ ایضاً، ص127
85۔ ایضاً، ص127
86۔ طاہر مسعود، خوشبو کی ہجرت، ص107
87۔ ایضاً، ص108
88۔ ایضاً، ص108
89۔ ایضاً، ص108
90۔ ایضاً، ص108
91۔ ایضاً، ص109
92۔ ایضاً، ص109
93۔ ایضاً، ص109
94۔ رفاقت جاوید، پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا، ص56
95۔ طاہر مسعود، خوشبو کی ہجرت، ص110
96۔ ایضاً، ص111
97۔ ایضاً، ص111
98۔ ایضاً، ص111
99۔ ایضاً، ص111
100۔ ایضاً، ص111
101۔ ایضاً، ص112

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 187 (1,1)

102۔ ایضاً،ص112

103۔ ایضاً،ص109

104۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سُندربن،ص57

کتابیات

اختر شیرانی ۔خاکوں کے پس منظر میں تجزیاتی مطالعہ

1۔ احمد ندیم قاسمی،”میرے ہم قدم“لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2007ء

2۔ اورنگ زیب نیازی ڈاکٹر،”اُردو اَدب، ماحولیاتی تناظر“لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2022ء

3۔ جاوید اختر بھٹی،”20معروف ادبی شخصیات“لاہور، برائٹ بکس،2006ء

4۔ حزیں کاشمیری،”کہاں گئے وہ لوگ“لاہور،اِدارہ کتاب گھر،2005ء

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 188 (1,1)

5۔ خادم حسین بٹالوی، ''اختر و سلمیٰ کے خطوط''، لاہور، آئینہ ادب، 1957ء
6۔ رئیس احمد جعفری، ''دید و شنید''، کراچی، رئیس احمد جعفری اکیڈمی، اشاعت دوم، 1987ء
7۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء
8۔ شورش کاشمیری، ''قلمی چہرے''، کراچی، مجلسِ یادگارِ شورش کاشمیری، 1999ء
9۔ شوکت تھانوی، ''شیش محل''، لاہور، اُردو بُک سٹال، 1944ء
10۔ صادق الخیری، ''آسماں کیسے کیسے''، کراچی، شہناز بُک کلب، 1987ء
11۔ صادق الخیری، ''نایاب ہیں ہم''، کراچی، شہناز بُک کلب، 1983ء
12۔ ضیا ساجد مرتب، ''منتخب شاہکار شخصی خاکے''، لاہور، مکتبہ القریش، 1992ء
13۔ محمد طفیل، ''جناب''، لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، 1961ء
14۔ عاشق حسین بٹالوی، ''چند یادیں، چند تأثرات''، لاہور، آئینہ ادب، 1969ء
15۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر، ''وے صورتیں الٰہی''، لاہور، قومی کتب خانہ، 1976ء
16۔ فخر بخاری، ''مجموعہ گلہائے تاریخ''، لاہور، اظہار سنز، 2019ء
17۔ سعادت حسن منٹو، گنجے فرشتے، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء
18۔ مظہر محمود شیرانی ڈاکٹر، ''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1966ء
19۔ مظہر محمود شیرانی ڈاکٹر مرتب، ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی''، مجلسِ یادگارِ حافظ محمود شیرانی، 1981ء
20۔ مظہر محمود شیرانی ڈاکٹر، ''حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات''، جلد اوّل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، 1993ء
21۔ مظہر محمود شیرانی ڈاکٹر مرتب، ''جادۂ نسیاں'' از حکیم سید محمود احمد برکاتی، لاہور، کتاب سرائے، 2009ء
22۔ مظہر محمود شیرانی ڈاکٹر، ''کہاں سے لاؤں اُنھیں''، لاہور القا پبلی کیشنز، لاہور، 2011ء
23۔ میرزا ادیب، ناخن کا قرض، لاہور، امتزاج پبلی کیشنز، 1981ء
24۔ نصر اللہ خاں، ''کیا قافلہ جاتا ہے''، کراچی، مکتبہ تہذیب و فن، 1984ء
25۔ نیّر واسطی حکیم، ''سلمیٰ و اختر''، لاہور، کتاب خانہ نورس، 1950ء
26۔ یونس حسنی ڈاکٹر محمد، ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، 1976ء
27۔ یونس حسنی ڈاکٹر محمد مرتب، ''کلیاتِ اختر شیرانی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 2017ء

رسائل و جرائد

1۔ ''ماہِ نو''، کراچی، جنوری 1949ء

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 189 (1,1)

2۔ ’’نقوش‘‘ مکاتیب نمبر، جلد دوم،نومبر 1957

3۔ ’’نقوش‘‘،شخصیات نمبر، جلد دوم،مدیر محمد طفیل،لاہور،اکتوبر 1956ء

4۔ ’’نقوش‘‘ آپ بیتی نمبر، مدیر محمد طفیل، جون 1964ء

5۔ سہ ماہی ’’سورج‘‘، لاہور، مدیر تسلیم احمد تصور، سالنامہ، اکتوبر تا دسمبر، جلد 35 شمارہ 2، 2008ء

میراجی۔غلیظ پیکر،لطیف روح

1۔ احمد بشیر، جو ملے تھے راستے میں، لاہور، گورا پبلشرز، بار دوم، 1997ء

2۔ اے حمید، چاند چہرے، لاہور، القریش، 1995ء

3۔ اخلاق احمد دہلوی، پھر وہی بیاں اپنا، لاہور، مکتبۂ عالیہ، 1979ء

4۔ ارشد نعیم (مرتب) گنجینۂ گوہر (شاہد احمد دہلوی)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 2018ء

5۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء

6۔ تابش دہلوی، دید باز دید، کراچی، حیات اکیڈمی، 1990ء

7۔ جمیل جالبی ڈاکٹر (مرتّب)، کلیاتِ میراجی، لندن، اُردو مرکز، 1988ء

8۔ جمیل جالبی ڈاکٹر (مرتّب)، میراجی ایک مطالعہ، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، 1990ء

9۔ رشید امجد ڈاکٹر، میراجی شخصیت اور فن، لاہور، مغربی پاکستان اکیڈمی، 1995ء

10۔ سحاب قزلباش، میرا کوئی ماضی نہیں، کراچی، فضلی سنز، 1995ء

11۔ سعادت حسن منٹو، گنجے فرشتے، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء

12۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر، آوارگانِ عشق، لاہور ادارہ ادب وتنقید، 1980ء

13۔ عقیل عباس جعفری (مرتّب) چراغ روشن ہیں، کراچی، اٹلانٹس پبلی کیشنز، 2016ء

14۔ کمار پاشی (مرتّب)، میراجی، شخصیت اور فن، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1981ء

15۔ ممتاز مفتی، پیاز کے چھلکے، لاہور، الفیصل، 2006ء

16۔ وزیر آغا ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، لاہور سنگت پبلشرز، 2018ء

رسائل وجرائد

1۔ ادبی دُنیا، لاہور، دسمبر، جنوری 1949ء، 1950ء
2۔ ادبی دُنیا، لاہور، فروری 1950ء
3۔ ہفت روزہ ''اقدام''، لاہور، 9 نومبر 1952ء
4۔ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر 14، سالنامہ
5۔ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر 15, 16 سالنامہ 1950ء
6۔ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر 27 , 28 نومبر، دسمبر 1952ء
7۔ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، جلد اوّل

معصوم بادہ نوش (عبدالحمید عدم)

1۔ اسرار زیدی، بام و در جن سے روشن ہوئے، لاہور، مقبول اکیڈمی، 2007ء
2۔ اکمل علیمی، لاہور کے اہلِ قلم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2014ء
3۔ اے حمید، چاند چہرے، لاہور، مکتبہ القریش، 1985ء
4۔ حافظ لدھیانوی، متاعِ گم گشتہ، لاہور، اُردو کتاب گھر، 2005ء
5۔ حمیر ہاشمی، لاہور میں دفن خزینے، لاہور، علم وعرفان پبلشرز، 1998ء
6۔ خلش ہمدانی، عبدالحمید عدم نجی و مجلسی زندگی، لاہور، کلاسیک، 1994ء
7۔ خلیل احمد مرتب، اُردو کے شاہکار خاکے جلد اوّل، لاہور، فکشن ہاؤس، 2017ء
8۔ سلیم اختر ڈاکٹر، درشن جھروکہ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء
9۔ شورش کاشمیری، قلمی چہرے، کراچی، مجلسِ یادگارِ شورش، 1999ء
10۔ صادق نسیم، روشنی چراغوں کی، اسلام آباد، عکاس پبلی کیشنز، 2003ء
11۔ ضمیر جعفری سیّد، کتابی چہرے، راولپنڈی، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز، 1986ء
12۔ فارغ بخاری، دوسرا البم، لاہور، آئینۂ ادب، 1980ء
13۔ قمر یورش، یارانِ میکدہ، لاہور، عوامی پبلشرز، 1983ء
14۔ محمد زکریا ڈاکٹر خواجہ، کلیاتِ عدم، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 2009ء

رسائل و جرائد

1۔ فنون، لاہور، جدید غزل نمبر، جلد دوم، جنوری 1969ء
2۔ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، جلد دوم، اکتوبر 1956ء

ایک تھی پارو۔ پروین شاکر

1۔ احمد پراچہ، پروین شاکر احوال و آثار، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، 2003ء
2۔ احمد ندیم قاسمی، میرے ہم قدم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007ء
3۔ اشفاق احمد ورک، قلمی دشمنی، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 1992ء
4۔ اشفاق احمد ورک، خاکہ نگری، کراچی، اکادمی بازیافت، 2002ء
5۔ رفاقت جاوید، پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا، اسلام آباد، پروین شاکر ٹرسٹ، 2014ء
6۔ زاہد حسین بھٹی، کاندھے پہ دھرے ساز، لاہور، غالب نما، 1998ء
7۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، خوشبو کی ہم سفر، اسلام آباد، لفظ لوگ پبلی کیشنز، 2002ء
8۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پروین شاکر شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، 2007ء
9۔ شاہد حنائی، مرتب، نسوانی خاکے، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، 2015ء
10۔ عالیہ جلیل شاہ، تنہا چاند، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 1997ء
11۔ عرفان جاوید، سرخاب، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، 2020ء
12۔ فرحت پروین ملک، یادوں کا سُندر بن، میڈیا گرافکس، دربارِ ادب، 2022ء
13۔ کشور ناہید، مٹھی بھر یادیں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2015ء
14۔ نجمہ خانم ملک، پروین شاکر سوانحی خاکہ و دیگر مضامین، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، س ۔ن
15۔ ممتاز مفتی، اوکھے اولڑے، لاہور، فیروزسنز، 1995ء

رسائل و جرائد

1۔ کتابی سلسلہ "ادبِ عالیہ ۔2، کراچی، ادبِ عالیہ پبلی کیشنز، مارچ 2017ء
2۔ ماہِ نو، پروین شاکر نمبر جلد 75، شمارہ 03
3 روزنامہ جنگ، لاہور، 2 جنوری 1995ء

D 3/11/2025 5:06 PM PAGE 192 (1,1)

4 روزنامہ جنگ لاہور، سنڈے میگزین، 15 اکتوبر، 2017ء

5۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔سنڈے میگزین، 22 اکتوبر 2017ء

6۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔سنڈے میگزین، 29 کتوبر 2017ء

7۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔سنڈے میگزین، 5 نومبر 2017ء